PHONE : 7500

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1959ء

ضرورت سے زیادہ کسی کے پاس نہ رہے (القرآن 2/219)

حضرت ابو سعید خدری (رض) سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ (ص) کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپ (ص) نے فرمایا جس کے پاس سواری ضرورت سے زائد ہو وہ اس آدمی کو دیدے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زاد راہ زیادہ ہو وہ اسے دیدے جس کے پاس نہ ہو۔ اس طرح آپ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا حتکہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو ضرورت سے زیادہ کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔

(مسلم بحوالہ ریاض الصالحین امام نووی)۔

شائع کردہ:

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک

ہندوستان اور پاکستان سے: آٹھ روپے
غیر ممالک سے: ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ

ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلی فون: ۷۵۰۰

خط و کتابت کا پتہ: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵۔ بی۔ گلبرگ کالونی۔ لاہور

جلد ۱۲ | جون سنہ ۱۹۵۹ء | نمبر ۶

فہرست

لمعات	۲ — ۱۶
طلوعِ اسلام نے کیا دیا؟ (محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب)	۱۷ — ۲۵
قانونی کمیشن کے سوالنامہ کا جواب	۲۶ — ۲۸
اصولی ہدایات برائے بزمہائے طلوعِ اسلام	۲۹ — ۳۲
میرے باطنی مشاہدات (محترم چوہدری عبدالرحمٰن صاحب)	۳۳ — ۳۷
انسان اور تلاشِ سکون (محترم چوہدری افتخار احمد صاحب)	۳۸ — ۴۶
رابطۂ باہمی	۴۷ — ۴۸
نقد و نظر	۴۹ — ۶۷
حقائق و عبر	۶۹ — ۷۸
۱۔ ہمارا ہمسایہ۔ ۲۔ بھینس نیئنے والا خدا ۳۔ کتبِ حدیث کی صحیح پوزیشن۔ ۴۔ مسئلہ تقدیر ۵۔ اقبالؒ کے رازدان۔ ۶۔ ختم الخلفا کا مسئلہ ۷۔ عائلی کمیشن کی رپورٹ کے بعد	
اشتہارات	۷۹ — ۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سرِّ خدا کہ زاہد و عابد بکس نگفت
در حیرتم کہ بادہ کشاں از کجا شنید!

گردشِ روز و شب کا سلسلہ کچھ ایسا ہے کہ بساطِ کائنات پر واقعات و حوادث نمودار ہوتے ہیں۔ کچھ وقت کے لئے فضا میں تحرک پیدا کرتے اور پھر پردۂ عدم میں گم ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود تو گم ہو جاتے ہیں لیکن صفحۂ ہستی پر اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا جب کہا تھا کہ

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

اسی نوعیت کا ایک واقعہ تھا جو اس ماہ (مئی) کے اوائل میں پاکستان میں پیش آیا۔ یہ تھا صدرِ مملکت پاکستان (جنرل محمد ایوب خاں) کا وہ خطاب جس سے انہوں نے ٹنڈو الہ یار کے دارالعلوم میں علماء کے اجتماع کو نوازا۔ مقامِ تاسف ہے (اگرچہ ہمارے لئے یہ امر کچھ بھی تعجب انگیز نہیں) کہ اس خطاب کا ملک میں وہ چرچا نہیں ہوا جس کا یہ مستحق تھا۔ اسلئے

کہ اس وقت عوام میں پروپیگنڈہ کی مشینری عام طور پر مساجد ہیں اور ان پر مذہب پرست طبقہ کا کنٹرول ہے۔ اور اس خطاب کی عام شہرت اس طبقہ کے مفاد کے خلاف جاتی تھی۔ لہٰذا وہ اس کا چرچا کیوں کرتے؟ ہمارے خیال میں ضرورت تھی کہ خود حکومت کی مشینری اس خطاب کی عام اشاعت کرتی۔ ملک کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ کر کے اسے طول و عرض پاکستان میں پھیلایا جاتا۔ اسے "دینی اور دنیاوی" درسگاہوں (مکتبوں اور اسکولوں۔ دارالعلوموں اور کالجوں) کے طالب علموں تک پہنچایا جاتا۔ اور گھر گھر تقسیم کیا جاتا۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک یہ پہلا موقعہ ہے کہ مملکت کے سب سے بڑے ذمہ دار گوشے (یعنی خود صدر مملکت) کی طرف سے اسلام کے متعلق اس قدر حقیقت کشا انداز میں بات کی گئی ہو۔ صدر مملکت نے اپنے خطاب کی تمہید میں کہا کہ[1]

مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ میں اس قسم کے اجتماع میں عالمانہ تقریر کرنے کا اہل ہوں۔

یہ ٹھیک ہے کہ جنرل محمد ایوب خاں اصطلاحی معنوں میں "عالم" نہیں لیکن انھوں نے جو کچھ اسلام کے متعلق کہا ہے وہ علماء میں سے کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

مہر خدا کہ زاہد و عابد بکس نگفت
در حیرتم کہ بادہ کشاں از کجا شنید؟

ہم صدر مملکت پاکستان کو ان کی اس بالغ نظری، حقیقت کشائی اور حق گوئی و بے باکی پر درخورِ ہزار تبریک و تحسین سمجھتے ہیں۔

تمہید کے بعد صدر مملکت نے اپنے خطاب کا آغاز ان الفاظ سے کیا۔

کوئی چودہ سو برس کا عرصہ ہوا اسلام فضائے ہستی پر ابر رحمت بنکر نمودار ہوا۔ (یہ مذہب نہیں تھا بلکہ) ایک ترقی پسندانہ تحریک تھی جو اپنے زور دروں سے بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیتیں اپنے اندر رکھتی تھی۔ اس نے حیاتِ انسانی کو نیا پیکر، اس کی جدوجہد کو نئی تعبیر اور کاروانِ انسانیت کو نئی منزل عطا کر دی۔

اسلام کو (مذہب کی بجائے) ایک تحریک سمجھنا، روحِ اسلام سے گہری واقفیت کی دلیل ہے۔ تحریک حرکتِ مسلسل کا نام ہے۔ جہاں اس میں جمود پیدا ہوا تحریک ختم ہو گئی۔ اس کے برعکس، مذہب، عبادت ہوتا ہے۔ جامد معتقدات اور بے حس و بے حرکت رسومات سے۔ لہٰذا جس طرح حرکت اور جمود ایک دوسرے کی ضد ہیں، اسی طرح اسلام اور مذہب

---

[1] ہمارا خیال ہے کہ صدر مملکت نے اپنا خطاب اردو میں پڑھا تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود ہمیں اردو خطاب کی کوئی کاپی نہ مل سکی۔ ہمارے پیش نظر انگریزی کا خطاب ہے جو پاکستان ٹائمز بابت ۱۶ مئی ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ اقتباسات اس کا آزاد ترجمہ ہیں۔

ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ قرآن نے اسلام کے لئے مذہب کا لفظ استعمال نہیں کیا (یہ لفظ قرآن میں کہیں آیا ہی نہیں)۔ اس نے اسے الدین کہہ کر پکارا ہے۔ جس کے معنی ضابطۂ زندگی یا قانونِ حیات کے ہیں۔ حضرات انبیائے کرامؑ خدا کی طرف سے الدین لے کر آتے تھے لیکن ان کے بعد ان کے پیرو اُسے مذہب میں تبدیل کر دیتے تھے (جس طرح خود مسلمانوں نے بھی کیا)۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں خدا کی طرف سے بھیجا ہوا الدین اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہ تھا۔ ہر جگہ مذہب کا دور دورہ تھا۔ قرآن نے الدین کو اس کی اصلی اور مکمل شکل میں پیش کیا۔ اور یوں انسان کے سامنے مقاصد کی ایک نئی دنیا کا راستہ کھول دیا۔

اس کے بعد جنرل محمد ایوب خاں نے کہا۔

> جب تک یہ تحریک زندگی کا جزو بن کر رہی اس کے متبعین دنیا نے سائنس اور عملی علوم میں ایسے ایسے کارنامے دکھلاتے رہے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے کچھ زمانہ گذرنے کے بعد مسلمانوں نے اسلام کو نظری مذہب میں تبدیل کر دینے پر اپنی توجہات مرکوز کر دیں۔ اور دین بہ حیثیت تحریک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زندگی اور مذہب میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی۔ یہ تفریق آج تک ہماری زندگی کو متاثر کئے جا رہی ہے۔
>
> اسلام اس تفریق (یعنی مذہب اور زندگی کی ثنویت) کو مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن یہ فطرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ خود اسلام کے متبعین اس ثنویت کا شکار ہو کر رہ گئے۔

اسلام کے قرنِ اول کی محیر العقول ترقی اور اس کے بعد اس کے آغازِ زوال کی داستان کو اتنے مختصر الفاظ میں بہت کم بیان کیا گیا ہوگا۔ اسلام، انسانی زندگی کے دھارے کا رخ متعین کرنے کے لئے آیا تھا۔ لیکن قرنِ اول کے بعد ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ مذہب زندگی کے راستہ میں سنگِ گراں بن کر بیٹھ گیا۔ یہی وہ مقدس پتھر ہے جس کے پجاری ہمارے اربابِ مذہب ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے کہا۔

> جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جائے تو زندگی تو بہرحال کسی نہ کسی سمت میں چلتی ہی رہتی ہے لیکن مذہب ایک ایسی بے جان شئے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے نہ حرکت اور نمو کی صلاحیت۔ یہ جامد اور متحجر مذہب (زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے) مسجدوں اور خانقاہوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ یہی ہوا۔ انسانیت، سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہونچ چکی ہے۔ لیکن ہمارا مذہب صدیوں سے ایک ہی مقام پر ساکت و صامت کھڑا ہے۔
>
> اسلام کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے مذہب پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انھوں نے خود

اسلام کو بت بنا دیا۔

اب ہر مکتب اور دارالعلوم میں اسی بت کی پرستش کے طور طریق سکھائے جاتے ہیں۔ اور ہر مسجد اور خانقاہ میں اسکی پوجا کرائی جاتی ہے۔ امت کی یہی وہ شومیٔ قسمت تھی جس پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے حکیم الامتؒ نے کہا تھا کہ

شہری ہو، دہاتی ہو، مسلمان ہے سادہ — مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا — ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد — زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

اس کے بعد صدرِ مملکت نے کہا۔

مذہب کو یوں بت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ جس نے ہماری قومی ذہنیت اور ثقافت پر تباہ کن اثر ڈالا یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصرِ حاضر کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے قدم اٹھایا۔ ان پر "دنیادار مسلمان" کی مہر ثبت کر دی گئی۔ اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دنیا میں جمود و سکون کے مجسمے بن کر رہ گئے وہ سچے اور پکے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ، مستقبل کی طرف نگاہ رکھ کر شاہراہِ حیات پر آگے بڑھنے والے اسلام سے منحرف اور برگشتہ شمار ہونے لگے اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدس دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئے اقدام، ہر نئی ایجاد، ہر نئی تعلیم کے متعلق شور برپا کر دیا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں، ہر انقلابی راہ نما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے۔

ہماری تاریخ کے سابقہ ادوار میں جو کچھ ہوا اسے چھوڑیئے۔ خود ہمارے زمانے میں اس قسم کی انقلابی تحریکوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ سرسیدؒ کے خلاف پوری دنیائے "زہد و تقدس" لٹھ لے کر کیوں کھڑی ہو گئی؟ صرف اس لئے کہ وہ مسلمانوں کو زندہ اقوام کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل بنانے کی تدبیریں سوچتا تھا۔ جمال الدین افغانیؒ کو ساری عمر صحرا نوردیوں اور دشت پیمائیوں میں کیوں بسر کرنی پڑی؟ محض اس لئے کہ وہ مسلم ممالک کے خس و خاشاک میں حرکت و عمل کی چنگاری سلگانا چاہتا تھا۔ آج ہر منبر و محراب طلوعِ اسلام کے خلاف سب و شتم کا سرچشمہ اور طعن و تشنیع کا محطِ نشر الصوت (ریڈیو اسٹیشن) کیوں بن رہا ہے؟ صرف اس لئے کہ اس کی دعوت یہ ہے کہ اس مذہب کو چھوڑ کر جو ہمارے دورِ ملوکیت پرستی میں وضع ہوا تھا اس دین کی طرف آؤ جو ہمارے لئے خدا نے متعین کیا تھا اور اس کی پکار یہ ہے کہ مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷/۷۲) جس قوم کو اس دنیا کی سرفرازیاں اور سربلندیاں میسر نہیں وہ اگلی دنیا میں بھی خدا کی مقرب و مکرم نہیں بن سکتی۔

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

یہ ہے وہ جرم جس کی پاداش میں ہر صاحبِ عقل و بصیرت کے خلاف مُلّا کی بارگاہ سے کفر کے فتاوی صادر ہوتے رہتے ہیں۔

اپنے دعوے کی شہادت میں صدرِ مملکت نے کہا۔

> میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ذرا ان خطبات کا خالی الذہن ہو کر جائزہ لیں جو ہمارے ملک کی مسجدوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ موجودہ زمانہ کی چھوٹی سی چھوٹی بات پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ بات نئی ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے کہ اس قسم کے بلند اور باعظمت دین کو ترقی کا دشمن (اور علم و بصیرت کا حریف) بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صرف اسلام کے ساتھ ہی ظلم نہیں ہمارے ان نوجوانوں کے ساتھ بھی ظلم ہے جو آجکل کی ماڈرن دنیا میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز زندگی اور مذہب دونوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے کہ بیسویں صدی کے انسان پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ اگر اسے اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا ہے تو اسے کئی سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔

قرآن نے (بجز چند مستثنیات) زندگی کے غیر متبدل اصول دیئے۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہر دور کے مسلمانوں نے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین و ضوابط وضع کر کے ان کے مطابق زندگی بسر کرنی تھی قرآن کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنا تھا اور ان کی روشنی میں وضع کردہ جزئی قوانین کو زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ بدلتے جانا تھا۔ اس طرح ثبات (PERMANENCE) اور تغیر (CHANGE) کے حسین امتزاج سے امت کو آگے بڑھتے جانا تھا۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو ہر زمانے میں بدلنے والی جزئیات کے متعلق بھی یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ وہ (قرآنی اصولوں کی طرح) غیر متبدل ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ زمانہ کہیں سے کہیں جا پہنچا ہے اور مسلمان سے کہا جاتا ہے کہ وہ زندگی کے روزمرہ کے معمولات میں سینکڑوں برس پہلے کے معاشرہ کا اتباع کرے۔ آج کا مسلمان (جو سمجھ سوچ سے کام لینا چاہتا ہے) اس جامد مذہب کے اتباع میں وہی دشواری محسوس کرتا ہے جو دشواری اُس بیس سالہ نوجوان کو اُس وقت پیش آتی ہے جب اس سے کہا جائے کہ وہ اپنا وہی جوتا پہنے جو اسے دس برس کی عمر میں فٹ آیا کرتا تھا۔ اس اصرار کا نتیجہ ظاہر ہے۔ اگر اُس نوجوان کو ایسا جوتا مہیا کر نہ دیا جائے جو اُس کے پاؤں میں آج فٹ آئے تو وہ جوتا اتار پھینکے گا۔ اور تنگ جوتا پہننے پر ننگے پاؤں پھرنے کو ترجیح دے گا۔ ہمارا موجودہ نوجوان جو مذہب سے برگشتہ ہو رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ "جوتا پہننا" ایک اصولی بات ہے اُسے اس سے انکار نہیں۔ اسے انکار ہے "تنگ جوتا" پہننے سے۔ ہمارے اربابِ مذہب تکفیر و تفسیق کے فتاوی کے ہنٹر لئے سر پر کھڑے ہیں اور اس سے کہہ رہے ہیں کہ وہ تنگ جوتا پہنے اس طرح آپ چین

کی عورتوں کو (عہدِ جہالت میں) تو تنگ جوتے پہنا سکتے تھے۔ درد محسوس کرنے والے (یعنی عقل و فکر سے کام لینے والے) نوجوان کو نہیں پہنا سکتے۔

اس کے بعد صدرِ مملکت نے کہا کہ غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام جیسا متحرک۔ ترقی پسند۔ زندہ۔ دین اس قسم کا جامد مذہب کیسے بن گیا؟ اس سوال کے جواب میں انھوں نے اس کی چند وجوہات استفہامیہ انداز میں خود ہی بیان کیں۔ انھوں نے کہا

(۱) کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی نصب العین سے بھٹک گئے ہیں اور ایسا معاشرتی اور سیاسی نظام وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں جو بدلتے ہوئے تقاضوں اور تغیر پذیر قدروں کے ساتھ چلنے کی سکت رکھتا؟

(۲) یا ہم نے اپنے دین کو جنوں اور فرشتوں کی کہانیاں بنا کر اسے توہم پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور اندھی تقلید کا نعرہ بلند کر کے انسان کی تخلیقی آرزوؤں کا راستہ روک دیا ہے۔

(۳) یا اس کی وجہ وہ تصوف ہے جس نے (زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے) ہم میں فرار کی ذہنیت پیدا کر دی ہے اور زندگی کو قبروں اور حجروں میں محبوس کر دیا ہے۔

(۴) یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یہ غلط عقیدہ وضع کر رکھا ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اگلی دنیا میں نجات کے حقدار بن سکتے ہیں۔ کیا ہم اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہماری اس دنیا کی زندگی کے اعمال کا ثمر ہے اور ہم جنت میں وہی کھائیں گے جو کچھ ہم دنیا میں بوئیں گے؟

ان سوالات کو پیش کرنے کے بعد انھوں نے کہا۔

یہ سوالات بہت اہم ہیں۔ ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم ان عناصر کی جڑ کا سراغ لگائیں جنھوں نے اسلام کی برقِ آسا شعلہ صفت روح کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تحقیق میں ہمارے سامنے بہت سی ایسی حقیقتیں آئیں گی جو نہایت تلخ اور ناخوشگوار ہوں گی۔ لیکن ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم تلخیوں اور ناخوشگواریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یقینِ محکم کے ساتھ بیباکانہ انداز سے سرگرمِ جستجو رہیں۔

اس مقام پر محترم صدرِ مملکت نے بڑا اہم سوال اٹھایا ہے۔ ایسا اہم کہ صرف اس ایک سوال کے صحیح جواب پر نہ صرف مسلمانانِ پاکستان بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کا انحصار ہے۔ انھوں نے اسبابِ زوالِ امت کی جو چار وجوہات بیان کی ہیں، وہ اپنی اپنی جگہ بڑی اہم ہیں۔ لیکن وہ جڑ نہیں شاخیں ہیں۔ جڑ اس کی اور ہے اور وہ یہ کہ

ہم نے دین میں قرآن کریم کو سند اور حجت ماننے کے بجائے ان چیزوں کو سند

اور حجت قرار دے رکھا ہے جنہیں خدا نے سند اور حجت قرار نہیں دیا۔

جامد معاشرہ۔ توہم پرستانہ انسانے۔ تقلید کی زنجیریں۔ خانقاہیت کی برکت کی بیلیں یا "فی سبیل اللہ جنت کی آرزوئیں" سب اس اصل کی جڑیں اور مرض کی علامتیں ہیں۔ فقہ اور روایات کی ابدیت اور تصوف کی سرمدیت یا اسی غلط عقیدہ کی پیداوار ہیں۔ قرآن نے صرف قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا حکم دیا تھا (اسی کا نام خدا کو معبود ماننا ہے) لیکن اس عقیدہ کی رُو سے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے خدا اور بندے کے درمیان سینکڑوں معبود کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔ اور جب کبھی قرآن کے کسی قانون اور ان "معبودوں" کی طرف منسوب کردہ کسی قول میں تضاد ہو تو فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کے حکم کو منسوخ مانا جائے اور انسانوں کے قول کو ناسخ۔ ہمارا موجودہ اسلام خدا کا متعین فرمودہ دین نہیں۔ انسانوں کا مرتب کردہ مذہب ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کسی لمبی چوڑی کد و کاوش کی ضرورت نہیں۔ آپ قرآن کے کسی حکم کو لیجئے اور اس کے خلاف موجودہ مذہب میں جو کچھ اس ضمن میں ہو اسے سامنے لائیے اور ان ارباب شریعت سے پوچھئے۔ وہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ حق وہی ہے جس کے مطابق اس وقت عمل ہو رہا ہے۔ مثلاً قرآن کریم کی بنیادی تعلیم احترام آدمیت ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں غلامی کو ختم کر دیا۔ لیکن ہمارے ارباب مذہب اس پر اصرار کریں گے کہ اسلام میں غلامی جائز ہے۔ ایک شخص جتنی جی چاہے لونڈیاں رکھ سکتا ہے اور انہیں اپنے استعمال میں لا کر دوسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے۔ آپ ہزار کہئے کہ یہ چیز قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے لیکن وہ ایک نہیں مانیں گے اور اس پر مُصر رہیں گے کہ شریعت حقہ کا وہی فیصلہ ہے جسے وہ بیان فرماتے ہیں یا مثلاً قرآن کریم کا واضح فیصلہ ہے کہ نکاح ایک معاہدہ ہے جو عاقل اور بالغ فریقین کے درمیان ان کی باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے۔ لیکن ہمارے ارباب شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ نکاح دو دو سال کے بچوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ اپنی بات کی پچ میں وہ یہاں تک بھی کہہ گزریں گے کہ خود رسول اللہ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا نکاح چھ برس کی عمر میں ہوا تھا۔ حالانکہ یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے۔ حضرت عائشہؓ شادی کے وقت کم از کم سترہ برس کی عمر کی تھیں۔ یا مثلاً قرآن کریم نے حکم دیا ہے کہ تم اپنے ترکہ کی تقسیم کے متعلق وصیت کر دو لیکن ہمارے ارباب شریعت کا فتویٰ ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی مال ہی میں ہو سکتی ہے اور وہ بھی وارثوں کے لئے نہیں۔ یا مثلاً ان حضرات کا فیصلہ ہے کہ یتیم پوتے کو اپنے دادا کے ترکہ سے حصہ نہیں مل سکتا (اس لئے کہ وہ یتیم کیوں ہو گیا ہے !)۔ حالانکہ یہ فیصلہ قرآن کے یکسر خلاف ہے۔ اس قسم کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں ہماری مروجہ شریعت کے فیصلے قرآن کے یکسر خلاف ہیں۔ لیکن یہ حضرات قرآن کو سند اور حجت تسلیم نہیں کریں گے۔ مروجہ شریعت کو سند تسلیم کریں گے۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ قرآن کریم نے زندگی کے غیر متبدل اصول دیئے ہیں جو ہر زمانہ میں تمام

نوعِ انسانی کے لئے راہ نمائی کا کام دے سکتے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں اسلامی مملکت ہر دور میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین خود وضع کر سکتی ہے۔ لیکن ہمارے اربابِ شریعت کا فیصلہ ہے کہ جو کچھ ہمارے اسلاف کے زمانے میں ہو چکا ہے اس میں ذرا سے تغیر و تبدل کا بھی کسی کو حق نہیں۔ اسی بنا پر ان حضرات کا یہ فتویٰ تھا کہ مملکت کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ زمین کی ملکیت کے بارے میں کسی قسم کی حد بندی عاید کرے۔

یہ ہے اصل مرض۔ یہی ہے تمام فسادات کی جڑ۔ یہ ہے علت العلل۔ لہٰذا جب تک اس علت کا استیصال نہیں کیا جاتا، ملت کے امراض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے لئے واقعی جرأت مندانہ اقدام کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد صدرِ محترم نے فرمایا:

علمائے اسلام کے تشتت و انتشار کا ایک بڑا سبب مذہبی فرقہ بندی ہے۔ غلط یا صحیح، فرقے بہرحال موجود ہیں اور اس حقیقت سے صرفِ نظر کرنا حماقت ہے۔ اگر یہ بحث چھیڑ دی جائے کہ کون سا فرقہ حق پر ہے اور کون سا باطل پر تو اس کا نتیجہ تخریب کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

فرقہ بندی، ہمارے انتشار ہی کا موجب نہیں، قرآن کی رو سے شرک ہے۔ لہٰذا فرقوں کی موجودگی اور اسلام دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ سوال یہ ہے کہ فرقے مٹیں کس طرح سے؟ اس کے متعلق صاحبِ صدر نے کہا ہے کہ

اس کے لئے صحیح طریق یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے اختلافی نکات کو ابھارنے کی بجائے، ان امور پر زور دیا جائے جو ان میں مشترک ہیں۔ کیا یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ ایک دوسرے کی نکتہ چینی کرنے کی بجائے ہم اس پر زور دیں کہ اصل و بنیاد کے اعتبار سے ہم سب ایک ہیں۔ اس لئے کہ ہم سب ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس قسم کی وحدت کی فضا پیدا کرنے میں، دوسروں کے مقابلہ میں ہمارے علماء سب سے زیادہ امداد دے سکتے ہیں۔

اسی بات کو صدرِ مملکت نے اپنے خطاب کے آخر میں ان الفاظ میں دہرایا ہے۔

اس مقصد کے حصول کی ذمہ داری ہر ایک پاکستانی پر عاید ہوتی ہے۔ لیکن اس باب میں علماء کا فریضہ سب سے زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مقصد ایک مقدس امانت ہے۔ جسے آپ حضرات کے علم و فضل کے پیشِ نظر آپ کی تفویض میں دیا گیا ہے۔ اگر آپ نے اس ذمہ داری کو پورا کر دیا تو خدا کی رحمتیں آپ پر سایہ فگن ہوں گی۔ اور تاریخ آپ کے اس کارنامہ کو بہ تشکر محفوظ رکھے گی اور اس کی یاد قائم رہے گی۔

ہمیں افسوس ہے کہ محترم صدرِ مملکت نے اس باب میں اپنی توقعات غلط دامن سے وابستہ کی ہیں۔ یہ وہی

بات ہے جسے ہمارا ایک شاعر ان الفاظ میں کہہ گیا ہے کہ

میر کیا سادہ ہیں! جس نے انھیں بیمار کیا
اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں!

امت میں تمام تفرقہ علماء کا پیدا کردہ ہے۔ اسی تفرقے میں ان کی اپنی ہستی کا راز پوشیدہ ہے۔ ان حضرات سے یہ توقع رکھنا کہ یہ تفرقہ مٹا کر وحدت پیدا کر دیں گے، انتہائی خوش فہمی ہے۔ جو حضرات ان تمام مفسدہ انگیزیوں اور خونریزیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود جو امت کے لئے وجہ ہلاکت بنتی چلی آرہی ہیں، اتنی سی بات پر بھی متفق نہ ہو سکے کہ نماز میں ہاتھ کھلے رکھنے چاہئیں۔ سینہ پر ہاتھ باندھنے چاہئیں یا زیر ناف، وہ اپنے تمام اختلافات مٹا کر ایک امت کس طرح سے بن سکتے ہیں؟ جس زمانے میں پاکستان کا (مرحوم) آئین زیر ترتیب تھا، مختلف فرقوں کے (اکتیس) علماء کراچی میں جمع ہوئے تھے۔ یہ حضرات اپنے اس اجتماع کا تذکرہ بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ اس اجتماع میں انھوں نے ایک مطالبہ متفقہ طور پر پیش کیا تھا۔ وہ مطالبہ یہ تھا کہ ان کے مختلف فرقوں کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ سو جن حضرات کا اتفاق، فرقوں کی گرہوں کو مضبوط کرنے کے لئے عمل میں آئے، وہ فرقوں کو مٹا کر وحدت کس طرح پیدا کر سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے امت میں تفرقہ کو روکنے اور وحدت قائم رکھنے کی ذمہ داری افراد کے بجائے حکومت کے سر پر عاید کی ہے۔ یہ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ امت میں فرقے پیدا نہ ہونے دے اور جب پیدا ہو چکے ہوں تو انھیں ختم کر کے امت میں وحدت پیدا کرے۔ بظاہر یہ کام بڑا مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایسا مشکل نہیں۔ محترم صدر مملکت نے کہا ہے کہ تمام مسلمانوں کا ایک کتاب (قرآن کریم) پر ایمان ہے لہٰذا قرآن ہی امت کی وحدت کی بنیاد بن سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ

(۱) دین میں سند و حجت قرآن کو تسلیم کیا جائے

(۲) جو کچھ اس وقت ہمارے ہاں مذہب کے نام سے مروج ہے اسے قرآن کی روشنی میں پرکھ لیا جائے۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے رکھ لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔

(۳) قانون سازی کے سلسلہ میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ غیر متبدل قرآنی اصول (یا احکام) ہیں امت کو یہ حق حاصل ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، اپنے لئے جزئی قوانین خود وضع کرے۔ ان قوانین میں عند الضرورت تغیر و تبدل کیا جا سکے گا۔ لیکن قرآن کے اصول و احکام غیر متبدل رہیں گے۔

یہ اصول ہمارے آئین کی بنیاد ہونے چاہئیں۔ جب ان آئین کی روشنی میں ہم عملی مسائل کا حل تلاش کرتے اور ان پر عمل پیرا ہوتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں گے تو رفتہ رفتہ امت خود بخود ایک وحدت کے قالب میں ڈھلتی

جائے گی۔ یہ ہے ترقی مسلمانوں کا صحیح طریق۔

اس کے بعد صدر محترم نے ایک اور اہم بنیادی مسئلہ کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے کہا
دورِ حاضر کی ترقی پذیر دنیا میں رہتے ہوئے علماء کے لئے ضروری ہے کہ وہ سائنس۔ فلسفہ۔ معاشیات اور عصری تاریخ جیسے شعبوں کا علم حاصل کریں۔ اسی طرح جو نوجوان جدید تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ مذہب کے اصول و مبادیات سے باخبر ہوں ...... مجھے امید ہے کہ تعلیمی کمیشن اس اہم سوال پر پوری توجہ دے گا۔ لیکن یہ ایسا سوال ہے جس کی ساری ذمہ داری تعلیمی کمیشن پر عائد نہیں ہوتی۔ یہ درحقیقت علماء کا کام ہے۔ آپ حضرات اگر اسلام کو اس قسم کی روشنی اور اس قسم کی زبان میں پیش کریں جسے ہر ایک دیکھ اور سمجھ سکے ــــ یعنی معمل (لیباریٹری) میں ریسرچ کرنے والا طالب علم۔ یونیورسٹی میں پڑھانے والا پروفیسر کھیت میں ہل چلانے والا کاشتکار۔ کارخانہ میں کام کرنے والا مزدور ــــ سب اسلام کو سمجھ سکیں اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق زندگی اور حرارت کے اس سرچشمہ سے فیضیاب ہوتے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کی یہ خدمت آپ کے لئے باعثِ اعزاز ہوگی۔

کس قدر مقدس ہیں یہ آرزوئیں جن کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے! لیکن ہمیں پھر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس باب میں بھی محترم صدر مملکت غلط مقام سے اپنی توقعات وابستہ کر رہے ہیں۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید　　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

جن حضرات کے نزدیک (خود صدر مملکت کے الفاظ میں) ہر نیا اقدام، ہر نئی ایجاد، ہر نئی بات شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی ہو، ان سے یہ کہنا کہ وہ جدید سائنس، فلسفہ، اور تاریخ کا علم حاصل کریں، اُن کے نزدیک انہیں ارتکاب گناہ پر آمادہ اور مجبور کرنے کے مرادف ہے۔ وہ اس کے لئے کس طرح تیار ہو سکتے ہیں؟ مثال کے طور پر ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ

رسول اللہ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ۷۱، یا ۷۲ یا ۷۳ سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے ان بکروں کی پشت پر عرش ہے۔ جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔ (جامع ترمذی)

آپ سوچئے کہ جو لوگ اس قسم کی باتوں کو جزوِ دین قرار دیتے ہوں اور انہیں منسوب کرتے ہوں حضور نبی کریم کی ذاتِ گرامی کی طرف، ان سے کبھی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ علوم سائنس کا مطالعہ کریں گے؟ علاوہ بریں اس ضمن میں ایک بنیادی نکتہ ہے جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ صدر محترم نے شروع میں کہا ہے کہ امت کا زوال اس وقت شروع

ہوا جب مذہب کو زندگی سے الگ کر لیا گیا۔ اور یہ خلیج آج تک برابر قائم ہے۔ یہ ثنویت (یعنی مذہب اور زندگی میں بُعد و مغائرت) اس وقت شروع ہوئی تھی جب زندگی سے متعلق امور مملکت نے اپنے ہاتھ میں لے لئے اور "مذہبی امور" علماء کے سپرد ہو گئے۔ اس سے (SECULAR) اور (RELIGIOUS) کی تمیز پیدا ہوئی۔ ہمارے سابق حکمران طبقہ (انگریزوں) کو حکومت کی مشینری کے لئے تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے انہوں نے اسکول اور کالج کھولے۔ ان درسگاہوں میں (SECULAR) تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کے مقابلہ میں مکتب اور دارالعلوم تھے (جو پرائیویٹ انتظامات کے ماتحت لوگوں کی خیرات پر چلتے تھے) ان میں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ انگریز چلا گیا لیکن اس "سانپ کی لکیریں" ہمارے ہاں بدستور باقی ہیں۔ اب بھی ہمارے ہاں مذہبی مکاتب اور دارالعلوم الگ ہیں اور سیکولر تعلیم کی درسگاہیں (اسکول اور کالج) الگ۔ جب تک یہ درسگاہیں الگ الگ رہیں گی، وہ ثنویت ختم نہیں ہو سکے گی۔ جسے محترم صدرِ مملکت نے زوالِ امت کا اولین سبب قرار دیا ہے۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ ان الگ الگ اداروں کو ختم کیا جائے۔ تعلیم کے کلی نظام کو حکومت اپنی تحویل میں لے۔ اور اسے ایسی جدید بنیادوں پر استوار کرے جن کی رُو سے "دینی اور دنیاوی" تعلیم ایک ہی جگہ (اسکولوں اور کالجوں) میں دی جائے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "عالمِ دین" بننے کے لئے ایک خاص نوعیت (SPECIALISED NATURE) کی تعلیم کی ضرورت ہے جسے عام تعلیم کے ساتھ مخلوط نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ "مخصوص نوعیت" کی تعلیم فقہ سے متعلق ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں فقہ پرائیویٹ شے نہیں رہتی، خود حکومت کے قوانین کا نام فقہ ہوتا ہے۔ اور حکومت کے قوانین کی تعلیم کے لئے (حکومت کے کالجوں سے الگ) مکتبوں اور دارالعلوموں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اندریں حالات، موجودہ ثنویت (DUALISM) کو جس قدر جلد ختم کیا جائے اسی قدر ملت اسلام سے قریب تر ہو جائے گی۔

ہمارے ہاں کے دارالعلوم تو پھر بھی چھوٹے ہیں۔ دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دارالعلوم، جامعہ ازہر (مصر) کے متعلق علامہ مفتی محمد عبدہ کا فیصلہ تھا کہ

> جو شخص ازہر یا اس کی قبیل کے مدارس میں جتنی زیادہ مدت تک تحصیلِ علم کرتا ہے، اتنی ہی اس میں تحصیلِ علم کی صلاحیت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ (تفسیر المنار۔ جلد اول صفحہ ۱۸)

ان دارالعلوموں کے علماء و شیوخ کے متعلق ان کا قول تھا کہ

> علمائے ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے شیوخ و علماء وہ لوگ ہیں جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں۔ (ایضاً)

جب ازہر جیسے دارالعلوم اور مصر کے علماء و شیوخ کی یہ حالت ہے تو ہمارے دارالعلوموں اور ان میں پڑھانے والے اساتذہ یا وہاں کے فارغ التحصیل "علماء" کی جو علمی سطح ہو سکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔

اس کے بعد صدر مملکت نے اس خطرہ عظیم کا ذکر کیا جو ایک سیل سبک سیر وز مین گیر کی طرح امنڈے چلا آرہا ہے اور جس کے آگے

عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

یعنی کمیونزم کا خطرہ۔ مسلمانوں کے لئے یہ خطرہ کس قدر مہیب ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کے اظہار کے لئے ان الفاظ پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں جو طلوع اسلام کے اوراق پر مدت سے پیش کئے جا رہے ہیں۔ یعنی

> کمیونزم اور اسلام دو متضاد تصورات زندگی ہیں۔ نہ کوئی مسلمان اسلام کو مانتے ہوئے کمیونسٹ ہو سکتا ہے نہ کوئی کمیونسٹ کمیونزم کو مانتے ہوئے مسلمان ہو سکتا ہے۔

اس ضمن میں صدر مملکت نے فرمایا۔

> آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان کی باہمی کشمکش آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ کیمونزم تہیہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پر مسلط کر دے۔ مذہب کیمونزم کا کوئی موثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا۔ اس لئے کہ اس کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے نمودار ہوتی ہیں نظام کائنات میں ان کا بھی ایک مقام ہے لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ نوع انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اندریں حالات کیمونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے۔ اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے۔ کیمونزم کا فلسفہ اور مغرب کی مادی اقدار کی کشمکش میں صرف اسلام وہ نظری آئیڈیالوجی پیش کر سکتا ہے۔ جو روح انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ نوع انسانی کے لئے روس کی کیمونزم کا فلسفہ اور مغرب کا فلسفۂ مادیت دونوں جہنم ہیں۔ اور اس جہنم سے نجات کی راہ صرف اسلام سے مل سکتی ہے۔ لیکن اس اسلام سے جو قرآن کے دفتین میں محفوظ ہے نہ کہ اس اسلام میں جسے ہمارے علماء کرام پیش کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے پیش کردہ اسلام ہمارے دور سرمایہ داری کا وضع کردہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا اسلام نہ روسی کیمونزم کا جواب ہو سکتا ہے۔ نہ ہی مغرب کو نظام سرمایہ داری کے دلدل سے نکالنے کا اہل۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کے پیش نظر محترم صدر مملکت نے کہا کہ

> کیمونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصر حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے۔ بلکہ ایک تمدنی، سیاسی، معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔

ہمیں خوشی ہوئی کہ جس چیز کو طلوع اسلام تشکیل پاکستان کے وقت سے لے کر آج تک مسلسل اور متواتر پیش

کرتا چلا آرہا ہے۔ اس کی ضرورت اور اہمیت کا اعلان مملکت کے سب سے زیادہ ذمہ دار گوشے کی طرف سے ہو رہا ہے۔ طلوع اسلام کی پیش کردہ دعوت کی رو سے قرآن ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے (اسی کو اسلامی مملکت کہتے ہیں) جس میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی۔ ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اور انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کے ارتقاء کے لئے سامان و ذرائع کی بہم رسانی معاشرہ (مملکت) کے ذمہ ہوتی ہے۔ مملکت اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک رزق کے سرچشمے (وسائل پیداوار) افراد کی ملکیت میں رہنے کی بجائے مملکت کی تحویل میں نہ آجائیں۔ اسی کا نام نظام ربوبیت ہے جو خدا کی صفت رب العالمینی کا عملی مظہر ہے۔ اس نظام کا قیام مغرب کی سرمایہ داری اور روس کی کمیونزم کا صحیح جواب ہے یہی طلوع اسلام کی دعوت ہے۔ اسی کے لئے اس نے حصول پاکستان کی تحریک میں "السابق الاوّل" کی حیثیت سے حصہ لیا تھا اور اسی کے لئے یہ اب مصروف سعی و کاوش ہے۔ چونکہ ہم اس نظام کے مختلف پہلوؤں پر قرآن کریم اور اسوۂ حسنہ نبی اکرمؐ کی روشنی میں ایک مدت سے غور و فکر کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس لئے ہم محترم صدر مملکت کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے اس مبارک و مسعود ارادہ کو عملی تشکیل دے دی تو وہ نہ صرف ملت اسلامیہ بلکہ تمام اقوام عالم کو اس شاہراہ حیات پر لے نکلیں گے جسے قرآن نے کاروان انسانیت کی منزل و مقصود کی طرف لے جانے والی صراط مستقیم قرار دیا ہے۔ چہ عجب کہ قرآن نے مقام ابراہیمیؑ کو نصب العین قرار دیتے ہوئے ملت اسلامیہ کے لئے نوع انسانی کی امامت (LEADERSHIP OF MANKIND) کا جو وعدہ کیا تھا، وہ چودہ سو سال کے بعد (جبکہ اس کا ایفا سرزمین حجاز میں ہوا تھا) بار دیگر خطۂ پاکستان میں پورا ہو۔ یہ آرزو اور یقین ہمارا ہی نہیں۔ خود صدر مملکت نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ

> اگر ہم (صحیح اسلام کے) اصولوں پر خلوص اور دیانت سے کاربند ہو جائیں تو ان شاء اللہ پاکستان نہ صرف ہمارے لئے بلکہ دنیا کے اسلام اور ہو سکتا ہے کہ سارے عالم کے لئے امن و سلامتی اور نور و فلاح کی زندہ مثال بن جائے گا۔

لیکن اس کے لئے انہوں نے جو فرمایا کہ

> اس اہم معاملہ میں بھی علماء ہماری مدد اور راہ نمائی کر سکتے ہیں۔

یہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ (جیسا پہلے کہا جا چکا ہے) بدقسمتی سے ہمارے علماء اس اسلام کو اصلی اور حقیقی دین سمجھے ہوئے ہیں جو ہمارے دور ملوکیت اور سرمایہ داری کی پیداوار ہے۔ ان کا یہ اسلام کم و بیش ان تمام عناصر کا محافظ ہے جن سے نظام سرمایہ داری (CAPITALISM) ترتیب پاتا ہے۔ مثلاً ان کا مذہب یہ

ہے کہ

(۱) ملکیت زمین کے لئے رقبے کی حد بندی اسلام کے مجموعی نظام میں کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتی

(مسئلہ ملکیت زمین۔ از سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، ص۵۴)

(۲) اسلامی قانون بیع وشریٰ نے کسی نوعیت کی جائز اشیاء کے معاملے میں بھی انسان پر یہ پابندی عائد نہیں کی ہے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص حد تک ان کو خرید سکتا ہو اور اس حد سے زیادہ کی خریداری کا مجاز نہ ہو۔ خرید و فروخت کا یہ غیر محدود حق جس طرح تمام جائز چیزوں کے معاملے میں آدمی کو حاصل ہے۔ اسی طرح زمین کے معاملے میں بھی حاصل ہے۔

(ایضاً ص۵۲)

(۳) اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔

(ایضاً ص۵۳)

ان "احکام شرعیہ" کی رو سے ظاہر ہے کہ حکومت پاکستان نے زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے وہ بھی یکسر "اسلام" کے خلاف ہے۔ ان حضرات کا اسلام معاشی مشکلات کا حل صرف صدقہ اور خیرات تجویز کرتا ہے۔ چنانچہ ان کا ارشاد ہے کہ

اسلام نے احسان اور فیاضی کی تعلیم تو زندگی کے ہر معاملہ میں دی لیکن واجبی حقوق وصول کر لینے کے بعد پھر کسی معاملہ میں بھی ہم اس کا طریقہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ فیاضی کو آدمی پر فرض قرار دیتا ہو۔ مثلاً جو شخص زکوٰۃ ادا کر چکا ہے اسلام اس کو یہ ترغیب تو ضرور دیتا ہے کہ وہ اپنا ضرورت سے زائد روپیہ حاجت مند لوگوں کو بخش دے۔ مگر وہ اس بخشش و سخاوت کو فرض نہیں کرتا۔ اور نہ یہ کہتا ہے کہ حاجت مند کو قرض کی شکل میں روپیہ دینا یا مضاربت کے اصول پر روپیہ دے کر اس کے کاروبار میں شریک ہو جانا حرام ہے۔ وہ صرف عطا اور بخشش ہی کی شکل میں ہونی چاہیئے۔

(ایضاً ص۳۵)

اکنامکس کا عام طالب علم بھی جانتا ہے کہ جو نظام ان "عقائد" پر متفرع ہوگا وہ سرمایہ داری کا نظام کہلائے گا۔ ایسا نظام کمیونزم کا توڑ کبھی نہیں بن سکتا۔ نہ ہی اس قوم کے افراد دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو سکتے ہیں جس میں حاجت مندوں کی ضروریات سرمایہ داروں کی خیرات سے پوری ہوں۔

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ جس اسلام کے علمبردار ہمارے علمائے کرام ہیں وہ اسلام کبھی کیمونزم کا جواب نہیں بن سکتا۔ وہ تو خود کیمونزم کے سیلاب کو دعوت دیتا ہے۔ کیمونزم کا جواب وہی نظام دے سکتا ہے جو قرآن

کی بنیادوں پر قائم ہو۔ اس قرآن کی بنیاد وہ ہے جس کا ارشاد ہے کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ یہ تجھ سے (اے رسول) پوچھتے ہیں کہ ہم اپنے مال و دولت میں سے کس قدر اپنے پاس رکھیں اور کس قدر منفعت عامہ کے لئے دے دیں قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ اس طرح قرآن فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کا وجود ختم کر دیتا ہے۔ جو نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے۔ (تفصیل ان امور کی طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "نظام ربوبیت" میں ملے گی)۔

یہ ہے صدر مملکت کا وہ خطاب جس کے متعلق ہم نے شروع میں کہا ہے کہ اگرچہ وہ ایک خاص تاریخ میں، خاص مقام پر پڑھا گیا۔ لیکن وہ اپنے گہرے نقوش صفحۂ تاریخ پر دوام چھوڑ گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس خطاب کو دیکھ لینے کے بعد ہمارے قارئین ہم سے متفق ہوں گے کہ جس (صدر مملکت) نے اسلام کو اس انداز سے پیش کیا ہے وہ مستحق صد مبارکباد ہے۔ خدا کرے کہ وہ اس تصور کے اسلام کو (جو قرآن کے تجویز کردہ اسلام کا صحیح تصور ہے) سرزمین پاکستان میں ایک عملی نظام کی شکل میں نافذ کرنے کے قابل ہو سکیں کس قدر مسعود و مبارک ہوگا وہ دن جب ایسا ہو جائے گا۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

کنونشن کے سلسلہ میں ضروری اطلاعات

چوہدری عبدالرحمٰن صاحب (صدر کنونشن کمیٹی) نے کنونشن کے سلسلہ میں آمد و خرچ کا حساب بھیجا ہے اس پرچہ میں اس کی گنجائش نہیں۔ آئندہ ماہ شائع ہو جائے گا۔

(۲) چوہدری صاحب نے کہا ہے کہ کنونشن کے سلسلہ میں تمام رقوم چوہدری صاحب کو بھیجنے کی بجائے مولانا عبدالرب صاحب (ناظم ادارہ طلوع اسلام) کو بھیجی جائیں۔ لیکن انہیں کسی دوسرے حساب کے ساتھ مخلوط نہ کیا جائے۔　　(ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ لاہور)

طلوعِ اسلام نے کیا دیا؟

(محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب)

یہ ہے وہ حقیقت کشا اور حیات انگیز خطاب جو ۱۹ اپریل کی شب کو ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب ایم۔ سی نے طلوعِ اسلام کنونشن میں دیا۔ خلوص میں ڈوبی ہوئی مردِ مجاہد کی یہ آواز ایوان کو فکر و نظر کی ان گہرائیوں میں لے گئی جہاں زندگی؟ اس کے مقاصد اور جانکاہ فرائض بے نقاب ہو کر نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ خود پرویز صاحب اس خطاب کے دوران میں تاثر میں ڈوبتے چلے گئے۔ اور خطاب کے خاتمہ پر نعرہ ہائے تحسین بلند کئے ہوئے سٹیج پر گئے اور ڈاکٹر صاحب کو تبریک پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ملت قابلِ مبارک ہے کہ اس میں ایسے فکرِ خالص رکھنے والے مردِ مجاہد موجود ہیں اور یہ کہ وہ خود کو بالخصوص قابلِ مبارکباد سمجھتے ہیں کہ ان کے پیش کردہ قرآنی فکر کے سمجھنے والوں میں ڈاکٹر موصوف جیسے مخلص اور مجاہد بھی شامل ہیں۔ پرویز صاحب نے دعا فرمائی کہ خدا محترم ڈاکٹر صاحب ایسے مخلصین کو ملت کے لئے باعثِ برکات بنائے۔

جن احباب کو طلوعِ اسلام کے ساتھ دلچسپی ہے ان سے اکثر سوال کرتا ہوں کہ طلوعِ اسلام کے لٹریچر میں وہ کونسی چیز ہے جو آپ کو پسند ہے۔ مختلف لوگوں کے مختلف جواب ہوتے ہیں۔ بعض بہنیں یہ کہتی سنی گئی ہیں کہ طاہرہ کے نام خطوط میں جو عائلی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ بے نظیر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ سلیم کے نام خطوط کا انداز بڑا دلکش ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "انسان نے کیا سوچا" میں بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ اکثریت ان احباب کی ہے جو نظامِ ربوبیت کے دلدادہ ہیں۔ ایک صاحب نے جو طلوعِ اسلام کی اکثر مخالفت کرتے ہیں لیکن جب مجھ سے ملتے ہیں تو ان کا رنگ گفتگو ذرا مختلف ہوتا ہے کہا کہ "معراجِ انسانیت" میں جو مستشرقین کی آراء رسول اللہ کے متعلق اکٹھی کی گئی ہیں وہ بڑی دلچسپ اور قابلِ داد ہیں۔ ایک صاحب نے الٹا مجھ پر سوال کر دیا کہ تم خود بتاؤ کہ تمہیں طلوعِ اسلام کی کونسی ادا پسند ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے جس چیز نے سب

سے پہلے اور سب سے زیادہ Attract کیا وہ اسلامی نظام کا نقشہ اور پھر نظامِ ربوبیت ہے لیکن میرے خیال میں یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں یہ صرف ہماری اپنی اپنی سیلانِ طبع کا اظہار ہے۔ جیسے ندی میں سے ہر ایک اپنی اپنی Capacity کے مطابق جتنا بھر لیتا ہے ضمناً انسانی زندگی کا وہ کونسا پہلو ہے جس پر قرآن نے روشنی نہیں ڈالی اور قرآن کا وہ کونسا گوشہ ہے جسے طلوعِ اسلام نے بے نقاب نہیں کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ طلوعِ اسلام کا قوم پر جو سب سے بڑا احسان ہے وہ یہ ہے کہ اس نے قوم کو Clear Thinking دیا ہے۔ حضرات! آپ کو قائداعظم کا وہ واقعہ یاد ہوگا جب تقسیمِ ملک سے پہلے وہ ایک مرتبہ نواب بھوپال سے ملنے گئے۔ واپسی پر نواب صاحب نے قائداعظم کے ہمراہ اپنے ایک سیکرٹری مسٹر حسین کو بھیجا۔ راستہ میں اس شخص نے قائداعظم سے سوال کیا کہ جناب! ملک کی فضا اس وقت خراب ہے ہر طرف افراتفری اور سیاسی بے چینی پائی جاتی ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی وجہ کیا ہے؟ قائداعظم نے کہا کہ مسٹر حسین آپ خود ہی بتائیے کہ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے۔ مسٹر حسین نے کہا کہ جناب میرے خیال میں قوم کے اندر Clear Thinking نہیں رہا۔ قائداعظم نے فوراً پلٹ کر جواب دیا کہ مسٹر حسین میں اس وقت سیدھا بمبئی جا رہا ہوں۔ اگر واپس نواب صاحب کے پاس جانا ہوتا تو ان سے کہتا کہ وہ آپ کو ایک بہت بڑی جاگیر بخش دیں۔

حضرات! قوم کے اندر Clear Thinking کا پیدا ہونا کوئی معمولی حادثہ نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج فضا بدل رہی ہے۔ بڑی تیزی سے نہ سہی بہرحال بدل رہی ہے۔ آپ پریس اور پلیٹ فارم پر تحریروں اور تقریروں کے انداز سے سمجھ سکتے ہیں کہ آج سے چار پانچ سال پیشتر کی فضا کیا تھی اور آج کیا ہے۔ اس وقت ملک کا Intelligentsia اسلامی ریاست کے تصور سے کانپتا تھا۔ اخبارات میں کھلم کھلا "اسلامی ریاست" کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے۔ اور لوگوں کے مزاج میں بڑی تندی تھی۔ مثال کے طور پر میں عرض کرتا ہوں کہ سنہ ۵۵ء میں جب دفعتہً ہماری دوسری آئین ساز اسمبلی ایک اسلامی آئین بنانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی، لاہور کے ایک انگریزی ہفتہ وار نے جو کچھ لکھا تھا میں اس کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ اس سے آپ حضرات اندازہ لگا سکیں گے کہ اس وقت اسلامی آئین کی مخالفت کی شدت کس قدر تھی۔ اس اخبار نے لکھا کہ یہ اسلامی ریاست ہے کیا؟ اور اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ کیا یہ موجودہ جمہوری تقاضوں کو پورا کر سکے گی؟ پھر لکھا کہ یہ (اسلامی) ریاست کے تصور ہی کے طفیل ہے کہ عرصہ آٹھ سال سے ملک کا آئین تیار نہیں ہو سکا۔ اس اسلامی ریاست کے نعرے نے دنیا کے سامنے ہمیں احمق بنا کر رکھ دیا ہے باہر کی دنیا کو ہم کیسے جھٹلا سکتے ہیں جب وہ ہمیں Sentimental Fools یعنی جذباتی بے وقوف کہہ کر پکارتے رہتے ہیں اور ہمیں Religious Extremists یعنی مذہبی انتہا پسند کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مذہبی دیوانگی خوراک ہے، کٹر پن وہاں کا قاعدہ ہے اور مذہب لوگوں کی افیون ہے

Fanaticism is the food, orthodoxy the rule and religion the dope.

پھر اس نے لکھا کہ ہم مذہبی بحثوں میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو کافر بنانے میں اس قدر مست ہیں کہ ہم دُنیا کے دیگر مسائل سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔ فلاں چیز اسلامی ہے۔ اور فلاں غیر اسلامی۔ فلاں مسلمان ہے اور فلاں کافر۔ اس کے سوا دنیا میں ہمیں کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اور ہماری نظر مذہبی دیوانگی پر ایسی جمی ہوئی ہے کہ ہم کبھی اسلام کے بیرونوں کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور ہم اپنے باپ دادوں کے کارناموں پر اس قدر مست ہیں کہ ہمیں مستقبل کی خبر نہیں اس نے پھر لکھا کہ ہمارا اسلامی سال بھی رونے پیٹنے سے شروع ہوتا ہے اور کوئی دھیان نہیں دیتا کہ اس رونے پیٹنے سے ہمارا مطلب کیا ہے۔ اگر ہم نے رونا ہے تو کیوں نہ ہم ان پاکستانی مسلمانوں کے لئے روئیں جو مر مر کر زندہ رہ رہے ہیں۔ جو روٹی کے ٹکڑوں اور چیتھڑوں کے لئے ترس رہے ہیں۔ اور کیوں نہ ان کے لئے روئیں جو کام کرنا چاہتے ہیں لیکن کام نہیں ملتا۔ اور ان بچوں کے لئے روئیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس لئے نہیں کر سکتے کہ وہ بے باپ کے یتیم بچے ہیں۔ اور اگر ہم نے آنسو بہانے ہیں تو کیوں نہ ان مریضوں کے لئے بہائیں جو بے دوا مر رہے ہیں۔ یہ خون کے آنسو کیوں نہ ان بھوکے ننگوں کے لئے بہائیں جو خستہ حالت میں سڑکوں پر پڑے ہیں۔ پھر لکھا کہ مذہبی ریاست کا تصور ہی جاہلانہ ہو گیا ہے جہاں ہم انسانوں کی طرح رہنا بھول چکے ہیں۔ یہ اسلامی ریاست کی تلاش جنگی نعرے کے شکاف سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی یعنی آئین ساز اسمبلی کے بنیادی اصولوں کی سفارشات کے متعلق اس نے لکھا کہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مصنفوں کو یقین ہے کہ موجودہ جمہوری اصول پاکستان کے لوگوں کے موافق نہیں۔ یہ مسودہ پاکستان کی ذلت اور جمہوریت کی توہین ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک چیلنج ہے۔ انسانی حقوق کی نفی ہے اور آزادی کے منہ پر ایک تھپڑ ہے۔ یہ دوبارہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی ایک مکارانہ چال ہے۔ یہ دوغلی دستاویز ہے جس میں ہر ایک اچھی چیز غائب ہے اور ہر بُری چیز کی نقل ہے۔ لوگ ان دقیانوسی چیزوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ چاہے انہیں اسلامی کہا جائے یا غیر اسلامی۔ ہم نے غیر ضروری طور پر اسلام کے گھوڑے کو اپنی سیاسی گاڑی کے آگے جوت رکھا ہے۔ حضرات! یہ تھے آج سے چار سال پہلے کے خیالات جو تعلیم یافتہ پاکستانی نوجوانوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اس سے آپ حضرات اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس طبقہ کی اسلام سے برگشتگی ملاازم کے خلاف کتنا بڑا Reaction ہے۔ ملا کی پریشان خیالی کا Reaction بھی کتنا پریشان کن ہے۔ یہ تھی وہ فضا جس کو درست کرنے کے لئے طلوعِ اسلام مسلسل کئی برسوں سے مصروفِ کار ہے۔ اسی اخبار میں جس کا میں ذکر کر چکا ہوں آرٹیکل شائع ہوتے رہے جو طلوعِ اسلام کے خیالات کی ترجمانی کرتے رہے ہیں۔ اور دو اور دو چار کی طرح بتاتے رہے کہ اسلامی ریاست کے متعلق جو گھناؤنا تصور پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر غلط ہے جس چیز کو اسلام کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ در اصل اسلام سے کس قدر دور ہے۔ وہ ایک پردہ ہے جو اسلام اور مسلمان قوم کے درمیان حائل ہے۔ وہ اسلام کے جسم میں ایک بہتا ہوا ناسور ہے جو اسے نڈھال کر رہا ہے اور یہ کہ اسلام پوجا پاٹ کا معاملہ نہیں۔ یہ اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ یہ ایک سوشل آرڈر ہے سوشل آرڈر کی بجائے مذہب میں تبدیل

اس وقت ہوا جب اس کی مرکزیت جاتی رہی۔ جب رسول کا Successor کوئی باقی نہ رہا۔ جب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والا امت کا کوئی نمائندہ باقی نہ رہا۔ جب Church and State دو جداگانہ Institutions بن گئے۔ یہ پھر سے سوشل آرڈر بن سکتا ہے اگر مرکزیت لوٹ آئے۔ اگر رسول کی Succession کے سلسلہ کو پھر سے قائم کر دیا جائے۔ اگر پیشوائیت جو اپنی طبعی موت مر رہی ہے اسے دفن کرنے کا جلد انتظام کیا جائے۔ پھر بتایا کہ اسلامی آئین بنانا کس قدر آسان ہو جاتا ہے اگر اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ Islamic Social Order درحقیقت Permance اور Change کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ اگر آپ موجودہ مسائل کی جزئیات کو قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر باہمی مشاورت سے طے کیا جائے۔ پھر بتایا کہ اسلامی طرزِ زندگی اور غربت و افلاس ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جہاں غربت و افلاس بے بسی اور بے کسی ہے وہاں اسلام نہیں۔

حضرات! لاہور کے پبلک جلسوں میں آج سے چند سال پیشتر کھلم کھلا زمینداروں اور جاگیرداروں کی حمایت کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے قارونوں کی حمایت میں آیاتِ قرآنی بڑی بے حیائی سے اپنا So-called اسلام پیش کرتے تھے۔ اور مترفین اپنی انجمنوں کے نام بڑے دلکش مثلاً مشرقی زرعی اصلاحات وغیرہ وغیرہ رکھتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مترفین کا گروہ اسلام کا پیدا کردہ ہے۔ اور صرف اسی ایک وجہ سے ہمارا مغرب زدہ تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے متنفر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن جب پبلک جلسوں میں نظامِ ربوبیت پیش ہونے لگا تو باوجود اس کے کہ یہ نقارخانے میں طوطی کی آواز تھی لوگوں نے کھڑے ہو کر کان لگانا شروع کیا کہ یہ نئی چیز کیا ہے۔ آہستہ آہستہ عوام کی طرف سے یہ مطالبات بھی ہونے شروع ہو گئے کہ وہ اس آواز کو بار بار سننے کے خواہشمند ہیں۔ اخبارات میں جب اس کے مضامین اس موضوع پر نکلنے شروع ہوئے تو لوگوں نے اس میں دلچسپی لی۔ گزشتہ دو ایک سالوں میں محترم پرویز صاحب کے دورے جو ملک کے اس حصے میں ہوئے ان کا بھی نہایت خوشگوار اثر ہوا۔ آج ملک کے چوٹی کے اخبارات باوجود اس کے کہ یہ آواز ان کی پالیسی کے مطابق نہیں بادلِ ناخواستہ ہی سہی اس میں حصہ ضرور لیتے ہیں۔ آج ملک کا Intelligentsia کم از کم یہ کھڑا ہو کر سوچنے ضرور لگا ہے کہ یہ آواز کیا ہے۔ یا کم از کم ان کے جذبات میں اسلام کے خلاف وہ تندی موجود نہیں جو پہلے تھی۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جنہیں میں بڑی مدت سے جانتا ہوں وہ ایسے لوگ تھے جو اسلام کے نام سے بڑے بیزار تھے لیکن اب وہ کم از کم اس مرحلے سے نکل چکے ہیں جس میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسلامی ریاست کا تصور جنگلی بطخ کے شکار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ تھوڑی بہت تبدیلی اس لئے ہے کہ قوم کے سامنے ایک واضح چیز پیش کی جا رہی ہے جس میں نہ الجھاؤ ہے اور نہ پریشان خیالی۔ لیکن حضرات! میں آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا کہ طلوعِ اسلام کا مشن بڑا کامیاب ہو چکا ہے۔ اس حد تک تو کامیاب ہے کہ ایک

خوشبو ہے جو پھول سے باہر آچکی ہے لیکن اس مشن کو کامیاب بنانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے کام Single-handed نہیں ہو سکتے۔ ایک مفکر اپنی دھن میں لگا ہوتا ہے وہ افکار کی دنیا میں بستا ہے اور ان کو دنیا کے سامنے پیش کرتا جاتا ہے۔ ان افکار میں اگر صلاحیت موجود ہو تو وہ اپنے اثرات خود بخود چھوڑ جاتے ہیں لیکن مفکر بذاتِ خود اس سے بے نیاز ہوتا ہے کہ کون اس کی طرف توجہ دیتا ہے اور کون نہیں۔ جو لوگ ان افکار سے اتفاق رکھتے ہیں اور اس مفکر کے ہم سفر بننے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ ان کا کام ہے کہ اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر لیں۔ اور اس کے پیغام کو عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ ان Ideals کو اپنانے کے بعد ان کا کام صرف یہی نہیں رہ جاتا کہ کتابیں پڑھتے رہیں، لیکچر سنتے رہیں اور خراجِ تحسین ادا کرتے رہیں۔ یہ بقول شخصے ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں جو لوگ محترم پرویز صاحب کے رفیقِ کار بننے کے متمنی ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ اس مشعل کو جو انھوں نے ان کے ہاتھ میں دی ہے لے کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل جائیں اور اگر اور جب ممکن ہو سکے ملک کے باہر بھی اس روشنی کو پھیلائیں۔

حضرات اگر ارادہ مضبوط ہو اور آنکھیں کھلی ہوں تو قدرتی طور پر ایسے مواقع ابھر ابھر کر سطح پر آتے رہتے ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ پریس، پلیٹ فارم و دیگر ممکن ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن افسوس کہ طلوعِ اسلام کی بزموں نے ابھی تک اس بات کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ آپ حضرات میں اکثریت ان احباب کی ہے جو اچھے پڑھے لکھے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو اچھا لکھ سکتے ہیں۔ اچھا بول سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پریس میں اہمیت اس چیز کو حاصل ہوتی ہے جو حالاتِ حاضرہ کے مطابق ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی ایسا ملکی مسئلہ ہو جس پر قرآن کی روشنی میں تبصرہ کی ضرورت نہ ہو۔ ایک سنجیدہ تبصرہ کا ہر اخبار خیر مقدم کرتا ہے اور حکومتِ وقت بھی اس چیز کی خواہشمند ہے کہ تعمیری تبصرہ پبلک کی طرف سے پریس میں آئے۔ چنانچہ مواقع ہیں۔ اس سلسلہ میں صرف ارادہ، ہمت اور استقلال کی ضرورت ہے۔ میں گذارش کر چکا ہوں کہ یہ کام Single-hand-.1 کرنے کا نہیں۔ اشد ضروری ہے کہ چند ذہین اور باہمت نوجوان اپنی زندگی اس کے لئے وقف کریں۔ ادارہ میں کچھ عرصہ زیرِ تربیت رہیں۔ اور اس کے بعد ملک کے گوشوں میں پھیل جائیں۔ محنت مشقت اور جان و مال کی قربانی کے بغیر حضرات! کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

اور یہ بھی اشد ضروری ہے کہ شہروں کے علاوہ دیہات کی طرف توجہ دی جائے۔ اس کے لئے سستے اور عام فہم لٹریچر کو پھیلانے کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ آپ نے کسی ذاتی یا سیاسی مقصد کے لئے نہیں کرنا، بلکہ ایک دینی فریضہ ادا کرنا ہے۔

حضرات! میں گذارش کر چکا ہوں کہ طلوعِ اسلام کا قوم پر بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو Clear Thinking دیا ہے۔ طلوعِ اسلام کی تعلیم کا جو دراصل قرآن ہی کی تعلیم ہے ایک نمایاں اور مفید ترین پہلو یہ ہے

کہ یہ فرقہ پرستی کے خلاف ہے اور اس نے ایسا فارمولا قوم کے سامنے رکھا ہے جس سے یہ بات دو اور دو چار کی طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ قوم کے اندر وحدت پیدا کرنے کا طریق کیا ہے۔ میں اس وقت نظریات پر بحث نہیں کر رہا کیونکہ یہ چیزیں آپ حضرات کے سامنے تفصیل کے ساتھ آچکی ہیں کہ قرآن فرقہ پرستی کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ محترم پرویز صاحب نے نہ صرف از روئے قرآن فرقہ پرستی کو شرک ثابت کیا ہے بلکہ فرقہ پرستی کی لعنت کو دور کرنے کے لئے طریق کار بھی تعین کیا ہے۔ جب انہوں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں کہ پہلے فرقے ختم ہوں اور پھر اسلامی آئین بنے بلکہ پاکستان کے آئین میں یہ شق داخل کی جائے کہ فرقہ پرستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے جس میں آجکل مرحوم سیاسی پارٹیاں مدفون ہیں۔ لیکن میرا مقصد اس وقت صرف یہ گذارش کرنا ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو صدیوں کے بعد مسلمان کے سامنے پھر سے بے نقاب ہو کر آئی ہے۔ اور یہ وہ سچائی ہے جو آج نہیں تو کل بالآخر امت مسلمہ کو اس پر آنا پڑے گا اور فرقہ پرستی اپنی طبعی موت مر کے رہے گی۔ اور یہ وہ دن ہوگا جب قوم کا ہر فرد محترم پرویز صاحب کا شکر گذار ہوگا۔ اور یہ دن قوم کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھیگا۔ حضرات! اس ضمن میں ایک گذارش آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال کے مطابق بڑی اہم ہے۔ اس برصغیر میں بہت سی سیاسی اور غیر سیاسی تحریکیں اٹھیں۔ ان میں سے ایسی تحریکیں بھی تھیں جو بڑے نیک مقاصد لے کر اٹھیں۔ ابتداء میں ہر ایسی تحریک پوری قوم کی تحریک بن کے ابھری۔ فرقہ پرستی کے خلاف رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ سمٹ سمٹا کر خود ایک فرقہ بن کے رہ گئی۔ اور اس شدت سے فرقہ بنی کہ اپنے اندر سوائے ان لوگوں کے جو پہلے سے موجود تھے کسی دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرتی تھی۔ مجھے ان چیزوں کا ذاتی تجربہ ہے۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ اس برصغیر میں جو مفکرین گذرے ہیں ان میں علامہ اقبال مرحوم نے بڑی عقلمندی سے کام لیا۔ اس لئے کہ وہ اپنے فکر کو عام کرتے گئے لیکن انہوں نے کوئی الگ جماعت نہیں بنائی۔ ایک تنظیم مقصود بالذات نہیں ہونی چاہیئے بلکہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ ہم خیال اصحاب کا کبھی کبھی مل بیٹھنا ضروری بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔ لیکن یہ اجتماعات صرف حصول مقصد کے لئے ہونے چاہئیں۔ گذشتہ چند مہینوں میں محترم پرویز صاحب کے ہاں ہر جمعہ کی شام کو ایک کلاس ہوتی تھی جس میں مختلف قرآنی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ چونکہ اس کلاس کا وقت تین بجے شام یعنی جمعہ کی نماز کے فوری بعد ہوتا تھا۔ اس لئے ایک صاحب نے تجویز پیش کی کہ جمعہ کی نماز شہر میں پڑھنے کی بجائے یہیں یعنی پرویز صاحب کے مکان پر ہی پڑھ لیا کریں۔ پرویز صاحب نے فوراً جواب دیا کہ ہاں مسجد قریب ہے یہاں آکر پڑھ لیا کریں۔ یہ بات بظاہر بڑی چھوٹی سی تھی اور آئی گئی ہو گئی۔ لیکن در اصل ایک بہت بڑے راز کی حامل تھی۔ حضرات! اگر ہم نے جمعہ کی نماز کا اجتماع الگ شروع کر دیا تو سمجھئے کہ فرقہ بندی کی طرف پہلا قدم اٹھ گیا۔ چنانچہ یہ بڑی اہم بات ہے کہ تعلیمی اور مشاورتی امور کے علاوہ ہم ہر مسجد اور ہر سوسائٹی میں پھیل جائیں۔ اور کوئی مسلمان چاہے اسے نظریات سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو ہم سے دوری محسوس نہ کرے۔

حضرات! گذشتہ چند صدیوں میں سائنس نے ہر شعبہ میں بے انداز ترقی کی ہے۔ جہاں اس کے اکثر شعبے ایسے ہیں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں وہاں چند شعبے ایسے بھی ہیں جن کی ترقی سے انسانیت کے لئے بڑے خطرات پیدا ہو گئے ہیں اور ان کے بھروسے پر ایک قوم دوسری قوم کو تباہ کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ انسان آج ستاروں کی دنیا سے آگے جانے کی فکر میں ہے لیکن انسانیت کے مسائل ابھی جوں کے توں پڑے ہیں۔ اور انسان کی عظیم ٹریجک جدوجہد کا ماحصل ناکامی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے ذہن انسانی آج بڑی کشمکش میں مبتلا ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو دو چیزیں ایسی نظر آئیں گی جن کا انسان کے درجۂ انسانیت کو بلند کرنے میں بڑا حصہ ہے۔ مذہب اور سائنس۔ جس وقت بھی دنیا پر تاریکی چھائی کوئی نہ کوئی نبی مشعل راہ لے کر نمودار ہوا۔ سوسائٹی کی اصلاح کی۔ جہالت کو دور کیا نسلی اور جغرافیائی حدود کو توڑا اور انسانیت کو کامیابی اور سربلندی کا راستہ دکھایا۔ لیکن آج کا مذہب جہاں انسانی ذہن پر زنگار کا کام دے رہا ہے وہاں سائنس سے بھی سوائے Perversion کے کچھ زیادہ حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ انسان پھر اس حقیقت کو فراموش کر چکا ہے کہ کان الناس امۃ واحدۃ۔ مذہب آج کیوں بے اثر بن کر رہ گیا ہے۔ آج بیسویں صدی کے علم کے پیاسے اور طاقت کے بھوکے انسان کو کیوں مذہب سے رغبت نہیں ہے؟ اس لئے کہ مسلمان کی تراشیدہ داڑھی۔ گرجے کی گھنٹی اور برہمن کی مالا میں ایک Scientific Mind کے لئے کوئی جاذبیت موجود نہیں۔ اس لئے آج کا سائنٹسٹ مذہب کو ایک بے حقیقت شے سمجھتا ہے۔ دوسری طرف اہل مذہب کے نزدیک سائنس ایک ایسی شے ہے جس نے انسان کو خدا سے دور کر دیا ہے۔ لیکن آج اہل مذہب کا اہل سائنس کے خلاف آواز اٹھانا چاند پر تھوکنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ایسی طاقت جس نے ارتقائے انسانی میں ایک بڑا اہم رول Play کیا ہو اسے گھٹیا قرار دینا اور اس کی مخالفت کرنا سوائے حماقت کے اور کیا ہے بالخصوص جب مخالفت ایک ایسے فریق کی طرف سے ہو جس میں ایک مذہب دوسرے کے خلاف۔ ایک مذہب کا ہر فرقہ دوسرے کے خلاف اور ایک فرقے کے افراد کا انداز فکر الگ الگ ہو۔ دوسری طرف سائنس جس کے اصولوں کی حیثیت Universal ہو جس میں ہر اصول کو ایک لیبارٹری میں پرکھا جا سکے اور ساری سائنٹیفک دنیا اسے بیک وقت اپنا سکے تو ایسی صورت میں اہل مذہب اہل سائنس کے آگے کیسے ٹھہر سکتے ہیں کالج کے Intelligentsia کے اندر مذہب سے بیزاری ہے۔ گو اہل مذہب جہل کے اندھے اب بھی اندھے کی لاٹھی گھماتے چلے جا رہے ہیں۔ حضرات! ایسے دور میں جب کہ Science Vs Religion کا یہ عالم ہو اور ان دونوں کے اختلافات کو Exploit کرنے کے لئے Petty-minded politician اپنے پورے حربے استعمال کر رہا ہو۔ طلوع اسلام کا یہ کھول کھول کر بیان کرنا اور اسناد سے قرآن ثابت کرنا کہ اسلام مذہب نہیں ہے بلکہ ایک Social Order ہے اس سوشل آرڈر کی Structure کیا ہے۔ سائنس کا مقام اس سوشل آرڈر میں کیا ہے۔ سائنس کی تحقیقات

کس طرح عین دین کے مطابق ہیں۔ اور ان تحقیقات کو جب قرآن کی دی ہوئی مستقل اقدار کی روشنی میں Apply کیا جائے تو کس طرح انسانیت کی تباہی کے بجائے انسانیت کے لئے باعثِ رحمت بن جاتی ہیں۔ یہ طلوعِ اسلام کی تعلیم کا بڑا روشن پہلو ہے جس پر جس قدر بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ اے کاش ہمارے پاس اتنے وسائل موجود ہوں کہ ان نظریات کو دنیا کے سامنے اس انداز سے رکھ سکیں جس کے یہ مستحق ہیں۔

طلوعِ اسلام نے قرآن کے اکثر ایسے گوشوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اگر ساری امت کے سامنے بے نقاب ہو جائیں تو جس بھنور میں، اس کی کشتی صدیوں سے پھنسی ہوئی ہے اس سے نکلنے کا فوری راستہ مل سکتا ہے۔ یہ طلوعِ اسلام ہی تھا جس نے قرآن کی روشنی دکھ کر زمین پر ذاتی ملکیت کے تقدس کو ملیامیٹ کر دیا۔ یہ طلوعِ اسلام ہی تھا جس نے اس حقیقت کو جو حرف قل العفو میں پوشیدہ تھی نمودار کیا۔ یہ طلوعِ اسلام ہی تھا جس نے Islamic Ideology کے خط و خال واضح طور پر قوم کے سامنے رکھے۔ درآنحالیکہ قوم کا کوئی بڑے سے بڑا تیس مار خاں پاکستان بننے کے بعد یہ نہ بتا سکا کہ آخر اس مملکت کے حصول کا مدعا کیا تھا؟ "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے کا مفہوم اگر کسی نے قوم کے سامنے رکھا تو طلوعِ اسلام اور صرف طلوعِ اسلام تھا۔ وحدتِ امت کا مفہوم اگر کسی نے قوم کو سمجھایا تو وہ طلوعِ اسلام تھا۔ یہ تخیل کہ فرد اپنی تمام صلاحیتوں کو نہ صرف اپنی پرورش بلکہ امت کی پرورش کے لئے صرف کرے۔ اگر فرد ایسا نہیں کرے گا تو نہ صرف اس کی اپنی بلکہ پوری ملت کی ارتقا رک جائے گی کس قدر حسین اور بلند تخیل ہے اور نوعِ انسانی کی مشکلات کا کتنا بڑا حل ہے۔ یہ نظریہ کہ بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ یہ کہ عدل کا مفہوم ہر فرد کی نشو و نما کے پورے مواقع بہم پہنچانا ہے اور احسان کا مفہوم جہاں کسی فرد کی نشو و نما میں کمی رہ جائے اس کو پورا کرنا ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی کا کتنا انقلاب انگیز پہلو ہے یہ کہ اسلامی مملکت میں مقصود بالذات مستقل اقدار کا تحفظ ہے اور یہ کہ Secular State کا مقصود ملک اور قوم کا تحفظ ہے چاہے اس مقصد کے حصول کے ذرائع کچھ بھی ہوں۔ یہ کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے اپنی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ کہ انسانی بچہ محض انسانی بچہ ہونے کی وجہ سے واجب التکریم ہے۔ یہ کہ ہر شخص کے مدارج اس کے ذاتی جوہر اور کام کی رُو سے مقرر ہوتے ہیں۔ یہ کہ سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو قوانینِ خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہو۔ یہ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے سے اپنا حکم منوائے حکم صرف اللہ کا ہے۔ یہ کہ کتاب کی وارث ساری امت ہے چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ساری امت کا فریضہ ہے۔ یہ کہ عملی انتظام کی سہولت کے لئے امت اپنے میں سے بہترین افراد کو اپنا نمائندہ بنا کر ختمِ رسول کے سلسلے کو قائم رکھتی ہے۔ اور یہ کہ رسول کی زندگی کے بعد خلیفۃ الرسول سے مراد ملت کی مرکزی Authority ہے جو رسول کا فریضہ یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ادا کرتی ہے۔ اس لئے کہ رسول کے بعد صرف مرکزِ ملت کو حق حاصل ہے کہ دینی امور میں فیصلہ دے۔ اور یہ کہ پیشوائیت کی Institution

کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں یہ دعویٰ ملوکیت کی پیداوار ہے۔ کتنے بڑے حقائق ہیں جن سے اگر قوم کو کسی نے آشنا کیا تو صرف طلوعِ اسلام نے کیا۔

دوسری طرف قرآن کا یہ گوشہ کہ وحی کا سلسلہ صرف انبیاء تک محدود ہے۔ اور یہ کہ عام انسانوں کا تعلق صرف خدا کے قانون کے ساتھ ہے۔ براہِ راست خدا کے ساتھ نہیں۔ یہ ان تمام چور دروازوں کو بند کر دیتا ہے جن کے ذریعہ خودساختہ نبی، اولیا، پیر فقیر حشرات الارض کی طرح نمودار ہوتے ہیں اور ملت کے جسم کے ساتھ جونکوں کی طرح چمٹ کر اس کا خون چوس چوس کر نڈھال کرتے رہتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کی آواز سب سے پہلی آواز ہے جس نے تاریخ کے ان بھیانک پردوں کو تار تار کیا جن کے اندر صدیوں سے اسلام چھپا تھا۔

حضرات! یہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔ یہ قرآن کے گوشے بڑی مدت کے بعد بے نقاب ہو کر سامنے آئے ہیں۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہم لوگ اس دور میں پیدا ہوئے جب قرآن کی روشنی پر سے بادل چھٹنے شروع ہو گئے ہیں۔ جب قرآن مسجد کے طاقوں اور غلافوں کے اندر سے نکل کر Intelligentsia کے Study-rooms میں پہنچنا شروع ہو گیا ہے۔ یہ ملتِ اسلامیہ پر پھر سے بہار کا آغاز ہے لیکن پھول کھلنے تب شروع ہوں گے جب ہم سب مل کر ہمت اور استقلال کے ساتھ قدم آگے بڑھائیں گے۔ جب ہم اپنی حالت خود بدلنے پر آمادہ ہو جائیں گے تو رحمتِ ایزدی یقیناً ہمارے شاملِ حال ہوگی۔ والسلام

مناسب رشتوں کی ضرورت

(۱) ایک معزز شریف گھرانے کی لڑکی کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی خوش شکل اور نیک سیرت ہے۔ عمر قریب بائیس سال۔ بی ٹی تک تعلیم ہے۔ لڑکا شریف ہو۔ آمدنی کا ذریعہ معقول ہو۔ عمر ۲۵-۳۰ سال تک ہو۔ لاہور کی سکونت لازمی ہے۔ س۔ ص۔ معرفت طلوعِ اسلام

(۲) قرآنی فکر کے حامل شریف، کاروباری تعلیم یافتہ نوجوان کے لئے رشتہ درکار ہے۔ لڑکی کا نیک سیرت، معمولی تعلیم یافتہ، امورِ خانہ داری سے واقف اور سلیقہ شعار ہونا ضروری ہے۔ ن۔ م۔ معرفت طلوعِ اسلام

(۳) شریف صحت مند۔ ملازمت پیشہ نوجوان لڑکے کے لئے ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جو صحت مند، قبول صورت، نیک سیرت اور سلیقہ شعار ہو۔ احمد۔ معرفت طلوعِ اسلام

قانونی کمیشن کے سوالنامہ کا جواب

قارئین کو علم ہے کہ حکومت نے ایک قانونی کمیشن مقرر کیا ہے تاکہ وہ بعد تحقیق، اس امر کی سفارشات کرے کہ موجودہ طریق عدل گستری (عدالتی نظم و نسق) میں کس قسم کی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جن سے عوام کو انصاف حاصل کرنے میں سہولتیں میسر ہوں۔ (واضح رہے کہ یہ قانونی کمیشن، اس اسلامک لاء کمیشن سے الگ ہے جو ۱۹۵۶ء میں آئین کے ماتحت مقرر ہوا تھا۔ لیکن آئین کی تنسیخ کے بعد وہ بھی کالعدم ہو گیا تھا۔ موجودہ کمیشن نے ایک سوالنامہ جاری کیا تھا جس کے جوابات ۱۰ مارچ تک طلب کئے گئے تھے۔ چونکہ اس کمیشن کا دائرہ تحقیق زیادہ تر عدالتی طریق کار (PROCEDURE) سے متعلق ہے اور چونکہ طلوع اسلام اپنے آپ کو بیشتر عدل کے اصولوں سے متعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس سوالنامہ کا بیشتر حصہ ہمارے تبصرے سے خارج تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنے جوابات کو صرف ان سوالات تک محدود رکھا جو ہماری دانست میں اصولی طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سوالات و جوابات کو قارئین کے استفادہ کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)

سوال:۔ کیا ماتحت عدالتوں کو ضلع کے صدر مقام میں ہی مرکوز رکھنا چاہیئے یا انہیں ضلع بھر میں پھیلا دینا چاہیئے؟

جواب:۔ عدالتوں کو ان مقامات میں ہونا چاہیئے جہاں دادخواہ لوگ آسانی سے پہنچ سکیں۔ ہمارے خیال میں انتظام ایسا ہونا چاہیئے۔ دادخواہ کو عدالت تک پہنچنے کے لئے پانچ میل سے زیادہ کی مسافت طے نہ کرنی پڑے۔ وقت کی اہمیت کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے عدالتوں کو ملک میں چاروں طرف پھیلا دینا چاہیئے۔

سوال۔ اس تجویز کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ بجائے اس کے کہ ملازمین حکومت کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی شکایات کا ازالہ بذریعہ عدالت کرائیں، اس مقصد کے لئے خاص انتظامی ٹریبونل مقرر کر دیئے جائیں۔

جواب:۔ جن امور کا تعلق ملازمت سے ہو ان کے لئے انتظامی ٹریبونل متعین کر دیئے جائیں۔ جو معاملات ملک

کے علم قانون سے متعلق ہوں۔ ان کے لئے عدالتوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

سوال۔ اس وقت مال سے متعلق مقدمات کے لئے الگ عدالتیں ہیں۔ ازدواجی زندگی سے متعلق تنازعات کے لئے الگ عدالتیں۔ اور خصوصی عدالتیں الگ ہیں۔ کیا عدالتوں کی یہ تقسیم قائم رکھی جائے۔ یا تمام مقدمات کی سماعت عام دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں ہوا کرے۔

جواب:۔ ازدواجی زندگی سے متعلق مقدمات کے لئے جداگانہ عدالتیں رہنی چاہئیں۔

سوال۔ قرآن کا حکم ہے کہ مسلمان میاں بیوی کے تنازعے کی صورت میں ایک ثالث میاں کے خاندان سے اور ایک بیوی کے خاندان سے مقرر کیا جائے۔ کیا آپ کے خیال میں قرآن کے اس حکم کو ضابطۂ دیوانی کا جزو بنا دیا جائے

جواب:۔ ضرور بنایا جائے۔

سوال۔ قانون۔ بالخصوص اسلامی قانون کے اعلیٰ مطالعہ اور تحقیق کے لئے کیا کیا طریق اختیار کئے جائیں۔

جواب:۔ قانون کے مطالعہ اور تحقیق میں قرآن کے ان بنیادی اصولوں کو شامل کیا جائے۔ جن کا تعلق احترام آدمیت۔ انسانی ذات اور عدل اور قسط سے ہے۔

سوال۔ وکلاء اور ان کی فیس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ ہمارے خیال میں وکالت کا پیشہ عدالتی نظم و نسق میں ممد و معاون ہونے کے بجائے موجب زحمت ہے۔ یہ پیشہ جرائم کے ارتکاب اور مقدمہ بازی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جس پیشہ میں قانونی مشورہ دینے کے لئے فیس لی جاتی ہو اسے قطعۃً بند کر دینا چاہیئے۔

وکلاء کو گورنمنٹ کا ملازم ہونا چاہیئے۔ ان کا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ بغیر فیس لئے لوگوں کو سمجھائیں کہ قانون کیا ہے۔ اور ان کے معاملہ کی قانونی پوزیشن کیا۔

لوگوں کو انصاف ملنا چاہیئے۔

سوال۔ ملزم دورانِ تفتیش میں جو بیان پولیس کو دیتا ہے، کیا اُسے عدالت میں بطور شہادت تسلیم کیا جانا چاہیئے؟

جواب۔ جو بیانات کسی قسم کے جبر و تشدد کے ماتحت دیئے جائیں۔ وہ شہادت قرار نہیں پا سکتے اور انہیں کبھی بطور شہادت تسلیم نہیں کیا جانا چاہیئے۔

پولیس کا فریضہ یہ ہے کہ قانون پر عمل کرائے اور جو قانون شکنی کریں انہیں ماخوذ کرے۔ تفتیش کرنا پولیس کا کام نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ کام کسی اور ایجنسی کے سپرد ہونا چاہیئے۔ دورانِ تفتیش میں ملزم کو پولیس کی حراست میں رکھنا ہی نہیں چاہیئے۔ انہیں جوڈیشیل حوالات میں رکھنا چاہیئے۔ جو بیانات اس جداگانہ ایجنسی کے سامنے دیئے

جائیں انہیں شہادت میں صحیح تسلیم کرنا چاہیئے۔ بعض بیانات کو صحیح تسلیم کر لینا اور بعض کو غلط قرار دیدینا درست نہیں اس سے جھوٹ کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

سوال۔ موجودہ طریقے کے مطابق، ملازمین حکومت کے خلاف تفتیش کرنے یا مقدمہ چلانے کے لئے افسر اعلیٰ کی منظوری لینا ضروری ہے۔ کیا اس طریق کو برقرار رکھا جانا چاہیئے۔

جواب۔ منظوری لینے کی شرط ختم کر دی جانی چاہیئے۔ قانون کی نگاہ میں ملازم حکومت اور دیگر شہریوں میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیئے۔

باقی رہا یہ سوال کہ لوگ ملازمین کو ناحق تنگ کرنے کے لئے ان کے خلاف غلط شکایات کرتے ہیں تو اس سے انہیں کس طرح محفوظ رکھا جائے؟ اس کے لئے یہ کرنا چاہیئے کہ جو شکایت غلط ثابت ہو شکایت کرنے والے کو عبرتناک سزا دی جائے۔

سوال۔ موجودہ ضابطے کے مطابق "فوجداری مقدمات میں" گواہوں سے حلف لیا جاتا ہے کیا اس طریق کو جاری رکھا جائے۔

جواب:۔ حلف لینے کے طریق کو ختم کر دیا جائے۔ اس سے اس کے سوا کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا کہ لوگ جھوٹ بولنے میں اور دلیر ہو جاتے ہیں، لفو قسموں سے احترام انسانیت اٹھ جاتا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ حلف کے بغیر کوئی شخص سچ بولتا نہیں۔ یہ عام تجربہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بھی معاملہ میں قسم کھا کر یقین دلوائے تو فریق ثانی اس کی بات کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

لیکن ایسے حالات میں جہاں قسم لینا ناگزیر ہو جائے (جیسے قرآن نے بعض حالات میں قسم اٹھانے کے لئے کہا ہے) تو اس بیان کو سچا تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اس میں نہ تو کسی قسم کا شبہ کرنا چاہیئے اور نہ ہی اسے مسترد کرنا چاہیئے (یعنی اگر حلفیہ بیان کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھنا ہو تو پھر حلف دینے کی ضرورت کیا ہے)

سوال۔ کیا طریق اختیار کیا جائے جس سے مقدمات کے فیصلے بلا تاخیر ہو جایا کریں۔

جواب:۔ عدل میں غیر معمولی تاخیر ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ جو انصاف دیر سے ملے وہ اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ہے۔ عام قاعدہ یہ ہونا چاہیئے کہ مقدمہ کی سماعت میں خواہ مخواہ تاریخیں نہ پڑیں۔ مقدمہ کی سماعت کرنے والا افسر بلا وجہ تاخیر کو خود ختم کر سکتا ہے۔ باقی رہا اس معاملے میں نگرانی کا سوال، جو دیانتدار اور فرض شناس افسر ہیں ان پر کسی نگرانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو افسر فرض شناس نہ ہوں ان کی نگرانی ضروری ہے لیکن نگرانی کا طریقہ ایسا مکمل ہونا چاہیئے کہ کوئی قصوروار اس کی نگاہ سے بچ نہ سکے۔

سوال۔ کورٹ فیس کی شرح وغیرہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے انصاف بلا قیمت ملنا چاہیئے۔ یہ ہر شہری کا بنیادی حق ہے جس کے لئے مملکت جدید میں آئی ہے۔ عدالتوں کے اخراجات سرکاری خزانوں سے ادا ہونے چاہئیں۔ اسلئے کورٹ فیس کا طریقہ ختم کر دینا چاہیئے۔ باقی رہا یہ کہ اس طرح لوگ یونہی مقدمات دائر کرتے چلے جائیں گے۔ سو اس کا علاج یہ ہے کہ جو دعویٰ غلط ثابت ہو اس کے لئے مدعی کو سخت سزا دی جائے۔

باسمہٖ تعالیٰ

اصولی ہدایات

برائے نظم و ضبط بزمہائے طلوعِ اسلام

(۱) بزمِ طلوعِ اسلام نہ سیاسی پارٹی ہے اور نہ مذہبی فرقہ۔ یہ ایک اجتماعی اور تنظیمی کوشش ہے اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جسے ادارہ طلوعِ اسلام پیش کرتا ہے۔ یہ قرآنی فکر زندگی کے عملی مسائل کا حل علم کی موجودہ سطح کے مطابق براہِ راست قرآن کریم سے معلوم کرتا ہے اور اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں، انہیں الگ کر کے اس نظام کی تشکیل کے لئے نقاضا سنگار رہتا ہے جو عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ (رضی اللہ عنہم) میں قائم ہوا تھا۔

(۲) ہر وہ مسلمان جو ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر سے متفق ہو اور ان ہدایات کو تسلیم کرے بزم متعلقہ کی منظوری سے اس کا ممبر بن سکتا ہے۔ ممبری کے لئے فارمِ رکنیت پر دستخط کرنا ضروری ہوگا۔ اس رکنیت سے نہ کوئی نیا عقیدہ اختیار کیا جاتا ہے نہ کسی کی اطاعت قبول کی جاتی ہے۔ عقائد وہی قابلِ قبول ہیں جن کا تعین قرآن کریم نے کیا ہے اور اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی واجب ہوتی ہے۔ اس رکنیت سے مقصد یہ ہے کہ یکجہتی، اتحادِ فکر و عمل اور نظم و ضبط کے ساتھ قرآنی فکر کو عام کیا جائے۔

(۳) ممبرانِ بزم کے لئے اسلامی ارکان کی حتی الامکان پابندی ضروری ہے۔ ان ارکان کی ادائیگی کے لئے جو طریقے مسلمانوں میں رائج ہیں، ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ جو اعمال و عقائد قرآن کے خلاف ہیں ان سے اجتناب ضروری ہے۔

(۴) ہر ممبر کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی سیرت و کردار کے لئے سیرتِ نبی اکرمؐ کو بطور نمونہ اپنے سامنے رکھے اور یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ کے قرآنی اصول کے مطابق خدمتِ خلق کے کاموں میں بلامزد و معاوضہ بیش از بیش حصہ لے۔

(۵) ارکان بزم انفرادی اور اجتماعی طور پر ایسی کوئی بات نہیں کریں گے جس میں فرقہ سازی یا پارٹی بازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے یا جس سے طلوع اسلام کے مقصد و مسلک کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو۔ ایسے ارکان کی صورت میں ادارہ کو حق ہوگا کہ وہ متعلقہ رکن کو رکنیت سے خارج کر دے اور متعلقہ بزم کی منظوری کو واپس لے لے۔

(۶) ادارہ کے فیصلے سے اختلاف کی صورت میں ادارہ سے مزید وضاحت طلب کی جا سکتی ہے۔ لیکن بزم کا ممبر رہتے ہوئے کوئی رکن اس فیصلے کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ اس اصول کا اطلاق ارکان کی طرح بزموں پر بھی ہوگا۔

(۷) ہر ممبر بطیب خاطر اپنے لئے ماہوار چندہ کی شرح خود مقرر کرے گا۔ لیکن جو شرح مقرر کی جائے گی (بزم کی منظوری کے بغیر) اس میں ایک سال سے پہلے کمی بیشی نہیں کی جائے گی۔

(۸) ہر گاؤں، قصبہ اور شہر میں ایک ایک بزم قائم کی جا سکتی ہے (بزم خواتین اس سے الگ ہوگی) ان بزموں کو ابتدائی بزمیں کہا جائے گا۔

جس مقام پر بزم قائم کرنے کا ارادہ ہو وہاں کے احباب اپنے ارادہ سے ادارہ طلوع اسلام کو مطلع کریں۔ اطلاع پانے پر ادارہ فارم رکنیت مع اصولی ہدایات اور دیگر معلومات مہیا کرے گا۔ جو احباب فارم رکنیت پر دستخط کر دیں گے وہ جمع ہو کر اتفاق رائے سے اپنے میں سے کسی ایک کو اپنا نمائندہ مقرر کریں گے اور نمائندہ دستخط شدہ فارم رکنیت اور اجتماع کی روئیداد ادارہ کو منظوری کے لئے بھیجے گا۔ منظوری کا اعلان ماہنامہ طلوع اسلام میں کیا جائے گا۔ ادارہ کی منظوری کے بغیر کوئی بزم مسلمہ نہیں سمجھی جائے گی۔

(۹) بزم کی تمام ذمہ داری نمائندہ پر ہوگی۔ نمائندہ عند الضرورت اپنی معاونت کے لئے اراکین میں سے جس کو مناسب سمجھے اسے کوئی کام سپرد کر سکتا ہے۔

(۱۰) ضلع کی ابتدائی بزموں کے نمائندے ضلع بزم کے اراکین متصور ہوں گے۔ یہ اراکین اپنے میں سے کسی ایک کو اپنا ترجمان اتفاق رائے سے مقرر کریں گے۔ ضلع بزم کے جملہ امور کے لئے مسئول ترجمان ہوگا۔ ترجمان اپنی معاونت کیلئے ضلع یا اپنی ابتدائی بزم کے اراکین میں سے جس کو مناسب سمجھے اسے ضروری امور سونپ سکتا ہے۔ جو صاحب ترجمان منتخب ہوں گے وہ ابتدائی بزم کے نمائندہ نہیں رہیں گے۔

(۱۱) طریق کار۔ جملہ معاملات کے تصفیہ میں قرآنی اصول اٹل سمجھے جائیں گے۔ قرآنی اصولوں کے تحت رہ کر فیصلہ نمائندہ / ترجمان کی صوابدید کے مطابق ہوگا۔ جو اتفاق یا کثرت رائے کو ملحوظ رکھے گا۔ فیصلہ کی پوری ذمہ داری نمائندہ / ترجمان پر ہوگی۔ ارکان اور نمائندہ / ترجمان میں اختلاف کی صورت میں معاملہ ادارہ کے سامنے لایا جائے گا اور ادارہ کا فیصلہ فریقین کو تسلیم کرنا ہوگا۔

نوٹ:۔ قرآنی اور مروجہ جمہوری طریق کار میں جو فرق ہے اسے سامنے رکھنا چاہیئے۔ جمہوریت میں فیصلے کا

آخری اور قطعی معیار کثرتِ رائے ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اسلام میں آخری اور قطعی معیار قرآن کے غیر متبدل اصول ہیں۔ قرآنی اصولوں کے اندر رہتے ہوئے اتفاق یا کثرتِ رائے پر عمل ہو سکتا ہے۔ جمہوریت میں فیصلہ کی ذمہ داری اکثریت پر ہوتی ہے۔ کسی فردِ واحد پر نہیں ہوتی۔ اسلام میں ذمہ داری متعلقہ فرد پر ہوتی ہے جس سے باز پرس کی جا سکتی ہے۔

(۲) ابتدائی بزم اور ضلع بزم فیصلہ کرے گی کہ۔

(۱) کن کن امور میں فیصلہ نمائندہ/ترجمان کر سکتا ہے اور کن میں فیصلہ بزم خود کرے گی۔

(۲) بزم کے اجلاس کتنے وقفہ کے بعد ہوں گے۔ اور ان کے لئے کورم کیا ہوگا۔

(۳) بزم کے ترجمان اپنا تعلق ناظم ادارہ طلوعِ اسلام سے رکھیں گے اور ادارہ کی طرف سے نافذ شدہ ہدایات پر خود بھی عمل پیرا ہوں گے اور انہیں ابتدائی بزموں کی طرف بھی منتقل کریں گے۔ اسی طرح ابتدائی بزمیں ضلع بزم کے ترجمان کی وساطت سے ادارہ کے ساتھ متعلق رہیں گی۔ جس ضلع میں ایک ہی بزم ہوگی وہ براہِ راست ادارہ سے متعلق رہے گی۔

(۴) بزموں کے نمائندگان اور ترجمان اپنی اپنی بزم کے صحیح نظم و نسق اور مالی امور کے پورے پورے ذمہ دار ہوں گے۔

(۵) ابتدائی بزموں کے نمائندگان بزم کی کارروائی کی ماہانہ رپورٹ اور آمد و خرچ کا گوشوارہ اپنے اپنے ترجمان کو بھیجیں گے۔ ترجمان پورے ضلع کی رپورٹ اور مجموعی گوشوارہ آمد و خرچ ہر ماہ ادارہ کو بھیجیں گے۔ ادارہ ان رپورٹوں کا ملخص اور مجموعی گوشوارہ کنونشن میں پیش کرے گا۔

اگر بزموں کے پاس فاضل روپیہ ہوگا تو کنونشن میں فیصلہ کیا جائے گا کہ اسے کس مصرف میں لایا جائے۔

ماہانہ رپورٹ مقررہ تاریخوں پر باقاعدگی سے بھیجی جائے گی۔ اس کی ترسیل میں غفلت متعلقہ بزم کی منظوری پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

(۶) ابتدائی بزموں کے نمائندے اپنے ضلع کے ترجمان کے مشورہ سے فیصلہ کریں گے کہ ابتدائی بزم اپنی آمدنی کا کتنا حصہ ضلع بزم کے اخراجات کے لئے ادا کرے گی۔ اور ضلع بزم کے ترجمان ادارہ کے مشورہ سے فیصلہ کریں گے کہ وہ اس میں سے کتنا حصہ ادارہ طلوعِ اسلام کو ادا کریں گے۔ ادارہ اس روپے کو صرف بزموں کے کام میں خرچ کرے گا۔ اور اس کا حساب کنونشن میں پیش کرے گا۔

(۷) تنظیم کے ابتدائی دور میں تمام انتخابات جن کا ذکر اوپر کی شقوں میں ہوا ہے سردست ہر سال ہوا کریں گے۔ ابتدائی بزموں کے انتخابات کنونشن سے قبل ضلع بزموں کے خود کنونشن میں۔ انتخاب کے اقدامات

کے لئے نمائندوں/ترجمان ذمہ دار ہوں گے۔ اگر کسی وجہ سے تاخیر کا اندیشہ ہو تو ابتدائی بزم کو اس کی منظوری (قبل از وقت) ضلع بزم سے اور ضلع بزم کو ادارہ سے لینی ہو گی۔

(۱۸) جملہ متنازعہ فیہ امور میں خواہ وہ ارکان اور نمائندہ/ترجمان کے درمیان ہو یا خود بزموں میں ہوں ادارہ کا فیصلہ آخری فیصلہ سمجھا جائے گا۔

(۱۹) ان ہدایات میں عملی تجربہ کی روشنی میں اگر ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہو گی تو ادارہ مزید ہدایات نافذ کرے گا۔

(۲۰) ہر معاملہ میں اس بنیادی حقیقت کو سامنے رکھنا ہو گا کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ خالصتاً لوجہ اللہ ہے اور ہر فیصلہ اور ہر عمل کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ وبیدہ التوفیق

(۲۱) جو احباب ان ہدایات سے متفق ہوں وہ فارم رکنیت پر دستخط کر کے اسے اپنی بزم کو دیدیں۔ فارم رکنیت پر دستخط کئے بغیر کوئی صاحب بزم کے رکن اور ادارہ کی منظوری حاصل کئے بغیر کوئی بزم تسلیم نہیں کی جائے گی۔ منظور شدہ بزموں کے نام مجلہ طلوع اسلام میں شائع ہوں گے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ لاہور

طلوعِ اسلام کے متعلق

(۱) زیر نظر شمارہ میں کنونشن کی دو ایک تصاویر شائع کی جا رہی ہیں۔ یہ تصاویر محترم یوسف ضیا صاحب (لشاور) کی ارسال فرمودہ ہیں۔ انہوں نے بہت سی تصاویر بھیجی تھیں جو طلوع اسلام کی تنگیٔ داماں کی شکوہ سنج ہیں۔

(۲) اس شمارہ میں کنونشن کی پہلی تین تقاریر شائع ہو سکی ہیں۔ باقی تقاریر آئندہ پرچہ میں شائع ہوں گی۔

(۳) آئندہ شمارہ میں "ہماری تاریخ" کے عنوان سے ایک اہم مقالہ شائع ہو رہا ہے۔ اسے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا جائے گا۔ بزمیں اپنی مطلوبہ تعداد سے اطلاع دیں۔

(۴) ہمیں افسوس ہے کہ مجلس اقبال اور اسلام کی سرگزشت کی اگلی قسطیں اس مرتبہ پھر شائع نہیں ہو سکیں۔ اس کے لئے عدم گنجائش مانع ہوئی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

میرے باطنی مشاہدات

[چوہدری عبدالرحمن صاحب کی تقریر جو انھوں نے ۹ر اپریل کی شب کے اجلاس میں فرمائی۔ تعارف کے لئے کنونشن کی روداد ملاحظہ فرمایئے جو ماہ مئی کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے]

گذشتہ دو کنونشنوں میں بعض احباب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ پہلے قدامت پرستی کی کن دلدلوں میں پھنسے ہوئے تھے اور اس کے بعد کس طرح قرآن کی طرف آئے۔ ان میں سے بعض کے واقعات بڑے دلچسپ اور سبق آموز تھے۔ جو احباب میری سرگزشت سے واقف ہیں ان کا تقاضا ہے کہ میں بھی اپنے سابقہ تجربات کنونشن میں شریک ہونے والے دوستوں کے سامنے پیش کروں۔ تاکہ بعض ایسی حقیقتوں سے پردہ اٹھ جائے جو محض پس پردہ ہونے کی وجہ سے حقیقتیں سمجھ لی جاتی ہیں لیکن جب ان سے پردے اٹھ جاتے ہیں تو وہ ذہن انسانی کے تراشیدہ توہمات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتیں۔ یہ حقیقتیں یا توہمات، وہ "باطنی مشاہدات" ہیں جن کا تعلق دنیائے روحانیات سے ہے اور جنہیں مغز دین کہا جاتا ہے۔ میں چونکہ ان وادیوں سے خود گذرا ہوں اس لئے چاہتا ہوں کہ آپ احباب کو بتاؤں کہ وہاں انسان پر کیا گذرتی ہے۔ کیا دکھائی دیتا ہے۔ اور اسے کیا سمجھا جاتا ہے۔

میری ابتدائی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی لیکن فطرت کی طرف سے سوچنے کی صلاحیت بھی عطا ہوئی تھی۔ جب میں نے قدیم یعنی مروجہ مذہب کی زندگی پر غور کیا تو اس میں مجھے کوئی حقیقت نظر نہ آئی اور میں اس سے غیر مطمئن ہو گیا۔ ہو سکتا تھا کہ میں اُسی مقام سے زندگی کے کسی دوسرے مقام کی طرف مڑ جاتا لیکن یہ باتیں بھی بچپن سے کانوں میں پڑی ہوئی تھیں کہ شریعت، ظاہر پرستی کا نام ہے۔ دین کی حقیقت، دراصل طریقت کے ہاں ملتی ہے وہاں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر میں نے خیال کیا کہ زندگی کے لئے کوئی نیا فیصلہ کرنے سے پہلے اس وادی کا دیکھ لینا بھی ضروری ہے۔ اس خیال کے ماتحت میں نے کسی راستہ دکھانے والے مرد کامل کی

تلاش شروع کی۔ اور میری خوش بختی ملاحظہ کیجئے کہ مجھے بہت جلد ایسا راہ نما مل گیا۔ اس وقت ایسا نظر آتا تھا گویا وہ دراصل خود میری تلاش میں تھا۔ میں انتہائی عقیدت کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور بات صاف صاف کہدی کہ میں حقیقت کو بے نقاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابتدائی مراحل کی سرگذشت کو طول دینے کی بجائے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ منزل کی طرف فوراً آ جاؤں۔ جس مقام پر اس وقت آپ کے سامنے کھڑا میں یہ داستان بیان کر رہا ہوں، اس کے بالکل سامنے سبز کھیتوں کے فاصلے پر ایک زمین دوز حجرہ تیار کرایا گیا۔ چھ فٹ لمبا۔ چھ فٹ چوڑا۔ چھ فٹ اونچا۔ اس میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشندان۔ صرف ایک دروازہ جسے اندر جانے کے بعد بند کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح وہاں نہ صرف یہ کہ باہر کی دنیا کی آواز تک نہیں پہنچ سکتی تھی بلکہ ہوا اور روشنی تک کا بھی گذر نہیں تھا۔ اس حجرے میں میرا چلہ شروع ہوا۔ ابتدائی مراحل جن کا تفصیلی ذکر میں نے ضروری نہیں سمجھا۔ درحقیقت میرے قلب یا ذہن کو اس چلہ کشی کے لئے آمادہ کرنے کے لئے تھے۔ میں اپنے راہ نما کی پوری پوری عقیدت۔ راہ کی دشواری کے دہشت انگیز تصور۔ اور منزل تک رسائی کے کامل یقین کے ساتھ اس حجرے میں داخل ہوا۔ اور اس ایمان کے ساتھ

کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

اپنے راہ نما کی ہر ہدایت کی تعمیل بلا چون وچرا کرتا چلا گیا۔ بھیانک تاریکی۔ سناٹا۔ تنہائی۔ دم گھٹنے والی فضا۔ ذہن پر پیدا کردہ اپنی دنیا کے تصورات۔ جانکاہ مشقتیں۔ جگر پاش ریاضتیں۔ بھوک۔ پیاس۔ بے خوابی۔ بے آرامی کے اثرات۔ ہوسکتا تھا کہ میں گھبرا کر نکل بھاگتا۔ لیکن حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی تمنا۔ خدا سے ملاقات کی تڑپ۔ اصل دین تک پہنچ جانے کی آرزو۔ ہمت بندھاتے چلی جاتی۔ اس پر ایک کشش یہ بھی کہ چند ہی دنوں کے بعد بہت سی عجیب و غریب چیزوں کے مشاہدات شروع ہو گئے۔ میں نے سمجھ لیا کہ حقیقتوں سے پردے اٹھنے لگ گئے ہیں۔ یہ دنیا جس کا نام ہی عالم لاہوت تھا بڑی حیرت انگیز اور ہولناک تھی۔ خوفناک لیکن اس کے ساتھ ہی بڑی دلچسپ بھی۔ ان حیرت انگیز مشاہدات کی لذت تھی جو ان تمام صبر آزما مراحل کو برداشت کرنے پر آمادہ کئے جا رہی تھی۔

دن گذرتے گئے۔ منزل قریب سے قریب تر آتی گئی۔ تیس۔ اکتیس۔ بتیس۔ حتیٰ کہ انتالیس۔ جوں جوں چالیسواں دن قریب آتا جاتا میرے راہ نما کی خوشیاں حدود فراموش ہوتی جاتیں۔ وہ ہر ایک سے کہتے کہ منزل کو اس تیزی سے طے کرنے والا سالک راہ حقیقت میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ اس نوجوان کی انتہائی خوش بختی ہے کہ پہلے ہی چلہ میں ان مقامات کو طے کر گیا ہے جن میں بڑے بڑے راہ نورد برسوں تک الجھتے رہتے ہیں۔ چالیسویں روز اس خلافت توفیق کامیابی کے جشن کا دن تھا۔ بہت سے بزرگ جمع کئے گئے۔ بہت سے مریدان باصفا بلائے گئے۔ بزم چراغاں ہوئی۔ عجیب وغریب رسومات ادا ہوئیں۔ اور ان تمام اہتمامات کے ساتھ مجھے عالم لاہوت سے اس خاکدان کی طرف لایا گیا۔ حکم دیا گیا کہ میری آنکھوں پر آنکھیں کوئی نہ ڈالے اس لئے کہ میں جس کی طرف دیکھتا تھا وہ تڑپ

اٹھتا تھا۔ میرے راہ نما نے جوشِ مسرت سے مجھ سے پوچھا کہ کیوں؟ حقیقت سے پردہ اٹھا؟ میں نے عرض کیا کہ بالکل اٹھ گیا۔ لیکن ہم دونوں کا مطلب مختلف تھا۔ انھوں نے یہ کہا تھا کہ مجھے دین کی حقیقت نظر آگئی؟ اور میں نے یہ جواب دیا تھا کہ مجھے یہ پتہ چل گیا کہ جسے روحانیت کہا جاتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ تھا وہ پردہ جو میری نگاہوں سے اٹھ چکا تھا۔ اور اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے میں نے یہ داستان آپ احباب کے سامنے بیان کرنی شروع کی ہے۔

میں نے اس سے پہلے ہپناٹزم پر بہت سا لٹریچر پڑھا تھا اور اس کی ہدایات پر کسی حد تک عمل بھی کیا تھا۔ میں جب اپنے چلے کے ابتدائی مراحل سے گزرا تو مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ تو وہی چیز ہے جسے میں ہپناٹزم میں پڑھ آیا ہوں۔ فرق بس اصطلاحات کا ہے یا طریقِ کار کا۔ ان کا طریق کار نسبتاً سائنٹیفک ہے اور ان کا قدیم طریق بہت (CRUDE) اور خواہ مخواہ کی پیدا کردہ مشکلات اور مصائب سے پُر۔ آئیے! میں آپ کو بتاؤں کہ یہ ہوتا کیا ہے۔

مثال کے طور پر شالامار باغ ہم سب نے دیکھا ہے۔ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ وہ باغ کیسا ہے تو آپ باقی چیزوں کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر اس باغ پر توجہ مرکوز کر لیں گے۔ دماغ میں اس باغ کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجائے گا اور آپ اسے یوں بیان کرنا شروع کر دیں گے گویا آپ اس کے سامنے کھڑے اس کی تفصیل بیان کر رہے ہیں۔ جو شخص آپ کے اس بیان کو سن رہا ہے اس کے ذہن میں بھی شالامار کا نقشہ مرتب ہوتا جاتا ہے۔ اگر کبھی دوسرے وقت اس سے شالامار کے متعلق کچھ پوچھیں تو وہ اس نقشے کی تفصیل بیان کرنے لگ جائے گا جو آپ کے بیان سے اس کے ذہن میں مرتب ہوا تھا۔

سوال یہ ہے کہ شالامار کا تصور آپ کے دماغ میں کہاں سے آیا؟ انسانی ذہن یا نفس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک کو شعور (CONSCIOUS) کہتے ہیں اور دوسرے کو لاشعور (UN-CONSCIOUS)۔ جو کچھ انسان کے شعور میں پہنچتا ہے اسے لاشعور اپنے ریکارڈ روم میں محفوظ کرتا چلا جاتا ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ چیز مٹ گئی یا گم ہو گئی ہے۔ لیکن لاشعور ان محفوظ کردہ نقوش کو باہر لانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ نیند میں یہی نقوش خواب بن کر سامنے آتے ہیں۔ لیکن بڑی بے ترتیبی کے ساتھ۔ بیداری کے عالم میں، انسان انہی نقوش کو اختیار و ارادہ سے سامنے لاتا ہے۔

آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ آپ کسی دوسرے شخص سے شالامار کا حال سن کر اس کا نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کر لیتے ہیں۔ آپ کے ذہن کا یہ شالامار وہی ہو سکتا ہے جو اس شخص نے بیان کیا ہے۔ اس طرح کسی کے ذہن میں کوئی نقشہ مرتب کر دینا (SUGGESTION) کہلاتا ہے۔ اسے روحانیت کی دنیا میں توجہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس توجہ سے جو کچھ کسی کے لاشعور میں محفوظ کر دیا جائے اسے جیتی جاگتی شکل میں سامنے دیکھ لینے کا نام روحانیت ہے

اس طریق کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ انسان کی پوری کی پوری قوت خیال ایک نقطہ پر مرکوز رہے۔ اور اس دوران میں اس کے دل میں کوئی اور خیال نہ گزرے۔ یعنی ذہن کے سوچنے اور سمجھنے کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں اس میں سب سے پہلی چیز دل میں طلب کا پیدا ہونا ہے۔ یہ طلب پیدا ہوتی ہے خدا کے خوف اور دنیاوی مصائب و آلام سے نجات حاصل کرنے کے خیال سے۔ جس قدر یہ چیزیں دل میں زیادہ راسخ ہوں گی اسی قدر انسان کی طلب میں شدت پیدا ہوتی جائے گی۔ طلب کی شدت سے عقیدت پیدا ہوتی ہے جو طالب کو کٹھن سے کٹھن راستے طے کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ اس کے بعد مرشد یا راہنما کے ہر حکم کی تعمیل سامنے آتی ہے۔ تعمیل اس انداز کی کہ ان کے دل میں بھی اس کے خلاف کوئی خیال پیدا نہ ہو۔ اس مقام تک لے جا کر، وہ راہنما اس طالب کے دل میں ایک (SUGGESTION) ڈالتا ہے۔ اور اس کی تمام توجہات کو اس نقطہ پر مرکوز کر دیتا ہے۔ کچھ دنوں کی مشق کے بعد وہ ذہن میں ڈالا ہوا نقشہ ایک حقیقت بن کر چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ پھر اور مشق کی جاتی ہے تو اس حقیقت سے انسان باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ چونکہ انسان پر سوچنے کے تمام دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اس لئے وہ جو کچھ دیکھتا ہے اسے اپنے لاشعور کا ریکارڈ سمجھنے کے بجائے خارجی حقیقت سمجھنے لگ جاتا اور اس پر یقین کر لیتا ہے۔ یہی چیز آخری مراحل میں "خدا سے ملاقات" کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف کے مختلف خانوادوں میں حقیقت بھی مختلف شکلوں میں دکھائی دیتی ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی کے ہاں حقیقت: وحدت الوجود بن کر سامنے آتی ہے تو امام سرہندی کے ہاں وحدت شہود کی شکل میں۔۔۔ حالانکہ یہ واضح ہے کہ حقیقت ایک ہے اور وہ جس کے سامنے بھی بے نقاب آئے گی اس کی شکل ایک ہی ہوگی۔

بہرحال یہ ہے وہ حقیقت جس سے میرے باطنی مشاہدات کے بعد پردہ اٹھا۔ میں نے اس باب میں جلد بازی سے کام نہ لیا بلکہ کچھ دن ہپناٹزم کے مطالعہ میں گذار کر پھر حجرہ میں جا داخل ہوا۔ اس دفعہ مراحل طے کرنے میں میری رفتار بہت تیز تھی۔ تیز بھی اور دور رس بھی۔ دور رسی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ میرے راہ نما حضرات ایک مقام پر رکے ہوئے تھے اور آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ میں نے چند دنوں میں وہ مقام طے کر کے انھیں بتا دیا۔ وہ محو حیرت رہ گئے۔ اس طرح میرا قیاس یقین میں بدل گیا۔ اور میں نے اپنے مشاہدہ اور تجربے سے اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا کہ روحانی طریق میں مغز دین کسے کہا جاتا ہے۔

میں ظاہر پرستی کے مذہب سے پہلے غیر مطمئن ہو چکا تھا۔ باطنی دعوائے حقیقت میرے سامنے اب بے نقاب ہو گیا۔ اس طرح، اقبال کی ہم نوائی میں

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

یہ وہ مقام تھا جہاں سے میں اپنے لئے نیا اور پختہ فیصلہ کرنے والا تھا۔ وہ فیصلہ کیا ہوگا اس کے متعلق آپ احباب خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اب اسے حسن اتفاق کہیئے یا میری خوش قسمتی کہ عین اُس وقت کسی نے مجھے طلوع اسلام کے لٹریچر کی نشان دہی کی۔ میں اب مذہبی لٹریچر کو دیکھنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ لیکن میرے مرحوم بھائی نے ——— کہ جس کی میرے دل میں بڑی وقعت تھی ——— مجھ سے کہا کہ تم اسے ضرور دیکھ لو۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ جب میرے سامنے قرآن کریم کی یہ آیت آئی کہ "مومن وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔" اور پھر یہ آیت کہ "اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ——— تم سوچا کرو ———" اور یہ آیت کہ اہل جہنم سے پوچھا جائیگا کہ تم یہاں کیسے ہو گئے تو وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم نے عقل و فکر سے کام نہ لیا اس لئے یہاں پہونچ گئے۔

میں ان آیات کو پڑھتا تھا اور محو حیرت رہ جاتا تھا کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا مذہب بھی ہے جو اپنی بات کو عقل و فکر کی رو سے منواتا ہے۔ چونکہ مذہب کے متعلق سابقہ تجربات نے مجھے ذرا زیادہ سخت تنقیدی بنا دیا تھا، اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ جس شخص نے یہ لٹریچر پیش کیا ہے، اس سے خود ملوں۔ میرا بنیادی مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ کیا یہ شخص انہی وادیوں سے گذر کر یہ باتیں کہتا ہے جن سے میں گزرا ہوں یا محض فکری طور پر اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں نے تو صرف ایک چلہ کیا ہے اور اس کی آدھی زندگی انہی خلوت کدوں میں گذری ہے تو مجھے اطمینان ہوا۔ اب میں اطمینان و سکون کے ساتھ اس طرف آیا۔ جوں جوں قرآن سامنے آتا گیا میرے دل کی دنیا بدلتی چلی گئی اور یہ حقیقت بے نقاب ہوتی گئی کہ

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

یہ ہے برادران عزیز! میرے باطنی مشاہدات کی مختصر داستان۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ قرآن کے حقائق ان لوگوں کے سامنے زیادہ وضاحت سے آتے ہیں جو پہلے ان وادیوں سے بھی گذر چکے ہوں۔ جو اس حصہ "لا" کو ذاتی تجربوں کے بعد چھوڑتا ہے، وہ اِلّا کی طرف نہایت پختگی سے آتا ہے۔ میرا تجربہ بہر حال یہ ہے کہ اب دنیا کی کوئی عقیدت مندی اور توہم پرستی مجھے قرآن سے بیگانہ نہیں بنا سکتی۔ میں ساحرین دربار فرعون کی طرح، سحر کی اصلیت دیکھ چکنے کے بعد حقیقت پر ایمان لایا ہوں۔ اس لئے اب فریب تخیل کی رسیاں سانپ بن کر مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ میں اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی ناز کروں کم ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

والسلام

انسان اور تلاشِ سکون

[محترم چوہدری افتخار احمد صاحب کی تقریر جو انہوں نے ۱۸ اپریل کی صبح کنونشن کے اجلاس میں فرمائی۔ تعارف کے لئے کنونشن کی روئداد ملاحظہ فرمائیے جو ماہ مئی کے شمارہ میں شائع ہو چکی ہے]

محترم صدر و معزز حاضرین!

تاریخ آدم کے مندرجات سے انسانی زندگی کے خط و خال کچھ اس طرح نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ ازل ہی سے متجسس، مضطرب، متلون، علم جو اور کشمکش کا دلدادہ نظر آتا ہے۔ وہ ایک بے قرار و مضطرب دل لے کر آیا ہے جس کی تڑپ سے وہ کبھی کسی نئی دنیا کی تلاش میں سمندر کی متلاطم موجوں میں بے خوف و خطر کود جاتا ہے۔ کبھی وحشت خیز صحراؤں کی بادیہ پیمائی کرتا ہے اور کبھی پہاڑوں کے غیر منتہا سلسلوں میں سرگرداں ہوتا ہے۔

چنانچہ آج سے صدیوں پہلے اسی جستجو اور اضطراب نے اسے کسی نئی دنیا کی تلاش میں بحر بیکراں کے طوفانوں میں بے خوف و خطر کود جانے کی دعوت دی اور وہ لکڑی کے تختوں کے سہارے افق کی جانب بہہ نکلا۔ اسے اس سفر میں کس قدر مصائب و آلام کا سامنا ہوا۔ آج ہمارے ذہن اس کا ایک ہلکا سا خاکہ بھی کھینچنے سے معذور ہیں۔ لیکن ایک غیر شعوری اطمینان کہ وہ ضرور ایک نئی دنیا کو پالے گا اسے تمام دکھوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کی ہمت دلائے چلا جاتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سی دنیا میں جا نکلے گا۔ اور کون سی زمین کے کنارے اس کی منزل مراد بن جائیں گے۔ وہ صحرا ہوگا یا گلستان۔ سلسلہ کوہسار ہوگا یا غیر محیط میدان۔ اس کی معلومات اس قدر محدود تھیں کہ وہ ساحل سے ذرا دور کے جزائر سے بھی بے خبر تھا۔ لیکن وہ مقام و منزل سے بے پرواہ اپنے شوق کی دھن میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

پھر جب کبھی وہ کسی نئی زمین یا مقام کو پالیتا اور اس پر جو کیفیت طاری ہوتی۔ خوف و دہشت، مسرت و اشتیاق کے ملے جلے جذبات اس کے دل میں جو طوفان برپا کرتے۔ اس کا اندازہ کرنا بھی ہمارے بس کی بات نہیں۔ اسے قطعاً خبر نہ ہوتی کہ وہ جس زمین پر قدم رکھ رہا ہے وہاں کے باشندے وحشی ہیں یا مہذب۔ یا وہ خطہ ابھی

کی طرح پر وحشی جانوروں اور درندوں کا مسکن ہے؟ پھر آیا وہ قابل سکونت بھی ہے یا نہیں؟ یہ اور اسی قسم کے اور سوال اُس کے دل و دماغ کو پریشان کر دیتے کبھی اسے نہایت شدید اور نقصان دہ نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور کبھی خلاف توقع بڑا خوشگوار معاوضہ مل جاتا۔ بایں ہمہ وہ آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ چنانچہ آج اُن ان تھک مساعی کا ثمر ہمارے سامنے علم و ہنر سے مالا مال ایک عظیم الشان جگمگاتی دنیا ہے۔

آج ہمارے سر اُن مردانِ ہمت و محنت کوش کے سامنے بار تشکر سے جھک جاتے ہیں۔ ان کی جدوجہد نے مادیات کی دنیا میں ہمیں کیا کچھ دیا۔ اس کے لئے آپ پہلے ان کھنڈرات کو دیکھئے جو بابل اور نینوا میں برآمد ہوئے ہوئے ہیں۔ اور پھر اپنی موجودہ دنیا پر نگاہ ڈالئے۔ فرق نمایاں طور پر سامنے آ جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ انسان نے غیر معلوم عناصر پر جس قدر کھوج کی اتنی قدر حل طلب عقدے اس کے سامنے پھیلتے چلے گئے۔ جستجو نے اسے علم و حکمت کے خزانے کے ساتھ ذمہ داریوں کا انبارِ عظیم بھی سپرد کیا اور حالات کے ان نتائج سے اسے مفر بھی نہ تھا۔

انسانی زندگی کا بچپن سے جوانی تک تجزیہ کر کے دیکھئے۔ شوق و تجسس سے زیادہ کوئی چیز فطری نظر نہیں آئے گی۔ بچپن میں اسکی جستجو کا دائرہ اس کا اپنا جسم اور گرد و پیش کی اشیاء تھیں۔ لیکن جوانی میں یہ دائرہ پھیل کر اس ماحول کا احاطہ کر لیتا ہے جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ جب کبھی اُسے اپنے اس ماحول سے نکلنے کا موقع ملتا ہے اور وہ پہاڑوں، میدانوں اور کھیتوں میں قدرت کے نظارے دیکھتا ہے۔ تو خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات اس کے دل و دماغ کو محیط کر لیتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق پلٹتے جائیے، انسان کی تلاش و جستجو کے نئے نئے ابواب سامنے آتے جائیں گے۔ یہ سلسلہ ختم ہی نہیں ہونے پائے گا۔

جب انسان نے دیکھا کہ تمام سطح سمندر اور زمین کا گوشہ گوشہ اس کی قدم بوسیوں کا شرف حاصل کر چکا ہے تو وہ فضا کی پہنائیوں اور سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو گیا۔

انسان کی اس کوشش کا پہلا قدم کہ وہ ہوا میں کس طرح پرواز کر سکتا ہے، پرندوں کے اعضائے جسمانی کا تناسب اور اُن کے عمل کا گہرا مطالعہ تھا۔ اس نے نقلی پروں اور دُم کے اسی تناسب اور ویسے ہی عمل سے ہوا میں اڑنے کی کوشش کی۔ اس سعی میں کچھ افراد چھوٹی چھوٹی پروازوں میں کامیاب بھی ہوئے لیکن اکثر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن تجسس و تلاش کی روح کو چین نہ آیا اور اس نے اپنی کوششیں بغیر کسی توقف کے مسلسل جاری رکھیں حتیٰ کہ آج ہم ایسے طاقتور طیاروں کے ذریعے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک صرف چند ساعتوں میں پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن کیا انسان کو اس عظیم و کامیاب کوشش کے بعد سکون نصیب ہوا؟ قطعاً نہیں!

آج ہم اس کے ایسے منصوبوں اور عزائم کا مشاہدہ کر رہے ہیں جنہیں چشم فلک نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ

چاند میں راکٹ بھیجنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے اور اُس کے SATELLIT زمین کے گرد فضا میں گردش کر رہے ہیں۔ اس کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اُس وقت تک کبھی دم نہ لے گا جب تک اس کے قدم چاند کو نہ چھو لیں لیکن کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جائے گا؟ اس میں شک کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ابھی چند سال پیشتر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ فضا میں کبھی نہ اُڑ سکے گا۔ لیکن آج یہ ایک عام بات ہے۔ پھر اگر وہ چاند میں داخل ہو جائے اور اس کا چپہ چپہ چھان لے تو اس کے بعد بھی اس کے سامنے جستجو کا غیر محدود میدان ہو گا۔ فضا میں ابھی بیشمار ستارے و سیارے موجود ہیں جو اس کی ہمت و کوشش کا حریف بننے کے لئے منتظر ہیں۔ اگر یہ سلسلہ قائم رہا تو یقیناً ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ وہ ستاروں سے آگے اور دنیاؤں کی کھوج میں گامزن ہونے کی منصوبہ بندی کرے گا۔

آج جب کہ جیٹ طیارے۔ فضائی راکٹ اور اڑن طشتریاں کرۂ ارض پر چیلوں کی طرح منڈلا رہی ہیں تین مردوں اور ایک عورت نے ایک غبارہ میں بیٹھ کر سمندر کو عبور کیا ہے اور یہ اس حقیقت کی دلیل ہے کہ انسان کی جستجو کبھی سکون نہ پائے گی۔ اسی طرح زیرِ آب سفر میں اس کی کامیابی یقینی ہے۔ اس کوشش میں وہ بہت دور تک جا چکا ہے اور ایسے آلات تیار کئے گئے ہیں جو اسے زیرِ آب سانس لینے اور بلارکاوٹ چلنے میں آسانیاں بہم پہنچائیں۔ اگرچہ یہ کوشش غسل خانہ کی صورت سے شروع ہوئی لیکن انسان نے اسے جدید ترین ایٹمی طاقت کی آبدوز کشتیوں تک پہنچا دیا جو اسے زمانۂ امن و جنگ کے ہر موقع پر بے شمار منفعت بخشتے ہیں اور ان کے ذریعہ آج وہ پانی کی عمیق ترین گہرائیوں اور برف کی طرح جمے ہوئے سمندروں میں عرصۂ دراز تک رہ سکتا ہے اور اپنی عزائم مساعی جاری رکھ سکتا ہے۔ پھر یہ سہولتیں خواص تک ہی محدود نہیں بلکہ ایک عام آدمی کو بھی ایسے آلات میسر آ سکتے ہیں جو اسے سمندر کی تہہ میں مزید تلاش میں معاونت کریں۔

ہم نے دیکھا ہے کہ انسان نے اپنے ناقابلِ تسکین جذبۂ جستجو کے سبب کس قدر علم اور منفعت حاصل کی ہم اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ ہم فضائے بسیط میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور ہمارے سامنے آج بھی تجسس کی سیرابی کے بے شمار مواقع ہیں۔

قبل اس کے کہ میں انسان کی ان قابلِ قدر کوششوں کو تحقیق مبارکباد قرار دوں ایک واقعہ گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔ جنگِ عظیم کے ایک پہاڑی مورچے پر ایک سپاہی رائفل تانے افق پر نشانہ باندھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دشمن سامنے کی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہے وہ تاک میں تھا کہ جونہی اسے وہاں کوئی جنبش محسوس ہو وہ فوراً گولی چلا دے۔ لیکن عین اس وقت اچانک اس کی نگاہ اپنے پاؤں کی جانب جھکی اور اس نے اپنے پاؤں سے کوئی تین فٹ نیچے دشمن کے ایک سپاہی کو اپنی جانب رائفل تانے پایا۔ اس کے حواس خطا ہو گئے اور اس

کے منہ سے بے اختیار نکلا کہ "آہ! میں دشمن کو اپنے سے دور سمجھتا تھا اور وہ عین میرے آغوش میں ہے"۔

آپ بھی تجسس نظر آتے ہیں کہ اس واقعہ کو انسان کی کامرانیوں اور فخر طلبیوں سے کیا تعلق؟ لیکن برادران عزیز! یہ ضرب المثل تمام نوع انسانی پر صادق آتی ہے کہ چراغ تلے اندھیرا ہے۔ اس کی شمع علم و تحقیق کی شعاعیں سمندروں کی گہرائیوں، پہاڑوں کی بلندیوں اور زمین کی پہنائیوں کو بقعۂ نور بنا دیتی ہیں۔ لیکن افسوس! اس نے اس انہماک میں اپنی قریب ترین دنیا کو ظلمت و جہالت کے تاریک ترین غاروں میں تبدیل کر رکھا ہے۔ اس نے ستاروں کی دنیا کی کھوج لگائی۔ اس نے چاند کے لئے رخت سفر باندھا اور اس نے فضائے بے پیدا کنار میں اڑن طشتریاں پھینکیں لیکن اس کے من کی دنیا آج بھی ویران اور بے آباد ہے۔ اس نے زمین و آسمان کے پردے چاک کئے اور مادیات کے راز افشا کر دیئے۔ لیکن آج تک اس کا سراغ نہ لگا سکا کہ وہ خود کیا ہے۔ اپنے متعلق اس کا علم آج بھی اتنا ہی قلیل و محدود ہے۔ جتنا کہ زمانۂ قدیم میں تھا۔ بقول اقبال ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر نہ کر سکا

دنیا کے کتنے سائنسدانوں، موجدوں اور متلاشیوں نے یہ زحمت گوارا کی کہ وہ اپنی ذات کا مطالعہ کریں۔ کتنوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ خود کیا ہیں۔ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ ایک فرد کی سیرت و کردار کن عناصر سے مرتب ہوتی ہے۔ اس کے اثرات دوسروں کی دنیا میں کیا تغیرات پیدا کرتے ہیں۔ انسان کس سمت جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟

یہ موجد و متلاشی اپنی مساعی میں کتنی زر و دولت۔ کتنا وقت۔ کتنی قوت اور کتنا فکر صرف کرتے ہیں کہ قطب شمالی کی تحقیق کریں۔ سائنسدان اپنی تمام کوششیں اس لئے مخصوص کر دیتے ہیں کہ جانچ لیں کہ برف کے بہتے ہوئے تودے کے نیچے کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یا چاند کی دوسری سمت کیا ہے۔ لیکن کیا یہ چیزیں ان کی اپنی ذات کے اسرار سے زیادہ اہم ہیں؟ کیا کوئی تحقیق انسانی ذات کی اپنی تحقیق سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس نے سب کچھ دریافت کیا؟ کیا ایک مجسمۂ سنگ، سنگ تراش سے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے کیا ایجادات موجد سے زیادہ لائق تحسین ہیں؟

مادی و تجارتی نقطۂ نظر سے شاید ہم کچھ سوالوں کا جواب اثبات میں دیدیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی مصور کے شاہکار کے لئے زر و دولت کے انبار نچھاور کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ لیکن اگر اس مصور کا خرید لینا ممکن ہو تو

آتی ہمت پر بھی نہ خریدے۔ حالانکہ وہ شاہکار اسی کی کوشش و تخیل کا اک ادنیٰ نمونہ ہے۔

میں نے جو کچھ گذارش کیا ہے اس سے مقصود اشیاء کی مادی اہمیت کا بیان کرنا نہیں بلکہ حیات انسانی پر غور و تفکر ہے۔ ایک جیتا جاگتا انسان ـــــــ اس کا ردیہ۔ اس کے جذبات اور ذہنی رجحان۔ واقعتاً یہ باتیں انتہا درجہ کی اہمیت رکھتی ہیں۔ انسان کا نظریۂ زندگی، اس کے اصول، عقائد، طرز و اطوار۔ رد عمل۔ رشتہ ناطہ اور کیریکٹر ہی، اس کی منزل متعین کر سکتے ہیں! سوچیئے کتنی خوفناک حقیقت ہے کہ عوام تو ایک طرف خواص کی اکثریت بھی ان حقائق کی طرف قابل ذکر توجہ نہیں دیتی۔

فطرت کے کھوجی کو سب سے پہلے اپنی ذات کی کھوج کرنی چاہیئے۔ بس یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ دوسری اشیاء کی کھوج کا حقدار بن سکتا ہے اور نوع انسانی کی بہبود و فلاح کی منازل طے کر سکتا ہے

یہ امر یقینی ہے کہ تا وقتیکہ انسان خود اپنی ذات کی پہچان نہ کرے اور اس کی نشو و نما کے صحیح قواعد و ضوابط سے استفادہ ہو اس کی ایجادات کا اکثر حصہ خود انسانیت سوز نتائج کا موجب بن جاتا ہے۔ پروفیسر جوڈ ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"بے شک انسان منظاہر فطرت کو مسخر کرنے میں اپنے آبا و اجداد سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ لیکن جہاں تک اس کے اپنے سہنے اور دوسروں سے مل کر زندگی گذارنے یعنی اخلاقیات و سیاسیات کا تعلق ہے وہ اب تک وہیں ہے جہاں ہزار برس پہلے یونان کے قدیم باشندے تھے۔ ہم نے گو مادی ترقی تو بہت کر لی ہے۔ لیکن روحانی اور اخلاقی اقدار سے ہم ذرا بھی آگے نہیں بڑھے۔ اور آج رونا بھی اس بات کا ہے اور ساری ضرورت بھی یہی ہے کہ ہم مادی حیات کے مطابق اپنے اندر روحانی و اخلاقی عقل پیدا کریں تاکہ اس کا صحیح مصرف ہو سکے۔ ورنہ یہ طاقت وبال جان ہو جائے گی"

کسی ذمہ دار شخص سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک بچے کو بھرا ہوا پستول کھیلنے کو دیدے لیکن انسانیت سے تہی دامن اور مستقل اقدار سے نا آشنا انسان روز حیات سے کھیلتا ہوا داہیانہ طور پر ایٹمی ہتھیار تیار کئے چلا جا رہا ہے۔ اس کا ماحول مادیت کے اعتبار سے دلچسپ ترین ہے۔ اور انسانیت کے لحاظ سے جز لوم ناچیز۔ یہ اس دور کا انتہائی المیہ ہے کہ خارجی کائنات سے متعلق انسان کا علم انسانیت و اخلاقیات سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ حقیقت قابل توجہ اور باعث انگیز ہے کہ انسان جس نے جغرافیائی اور سائنس کی دنیا میں محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں اور بے شمار عجائب سے روشناس کرایا ہے۔ اپنی ذات اور حق کے بارے میں بے حد محدود علم رکھتا ہو۔ طبی تحقیقات نے اسے جسم اور اس کی کارکردگی کے متعلق وسیع معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ لیکن اس کی

ذات اس کا ذہن اور اس کی ذات کو وحشیانہ طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور ان سے عمداً بے توجہی برتی جاتی ہے۔
ممفورڈ نسل انسانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"امریکہ میں ہم نے ایک نئی نسل پیدا کی ہے۔ عمدہ توانائی۔ خوبصورت جسم لیکن دل بالکل خالی۔ وہ نسل جس کے نزدیک زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ ..... یہ مہذب وحشی حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ میں لیٹے ہوئے آفتابی غسل لے رہے ہیں..... سمندر کے ساحل پر یا اپنے کمرے کے لیمپ کے سامنے۔ کبھی بیکار جنسی میلان کے تحرک سے رقص کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ اپنے لباس کے بارے میں بہت محتاط ہیں لیکن احتیاط محض فیشن کی پابندی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ لوگ کھاتے ہیں۔ پیتے ہیں۔ شادی کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ ایسی زندگی جی کر جو اگر کامیاب ہے تو حیوانی نشاط انگیزی کی اور اگر ناکام ہے تو مسلسل خوف اور پریشانی کی۔ حیوانی سطح اور حیوانی تسکین کے علاوہ انھیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے۔ انھیں حیوانی حظ لطف نفس سے محروم کر دیجئے تو ان کے لئے جینا وبال دوش ہو جائے گا۔"

(انسان نے کیا سوچا صفحہ ۲۶۹)

یہ کیفیت صرف امریکہ ہی کے انسانوں کی نہیں بلکہ کم و بیش تمام دنیا کی یہی حالت ہے۔ مشرق مغرب کے نقش قدم پر والہانہ بھاگ رہا ہے۔ اس دوڑ دھوپ کا جو نتیجہ نکلے گا وہ درس نگاہیں اس سے بے خبر نہیں۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی

اس طرح وہ خصوصیات جو صرف انسان سے مختص ہیں اس سے ناپید ہو جاتی ہیں اور وہ مشین محض بن کر رہ جاتا ہے۔

E.A.BWNETT کے الفاظ میں "میکانکی تصور حیات کی رو سے حقیقت کی دنیا درشت اور کرخت بارد سبے رنگ و بے کیف خاموش اور مردہ دنیا بن گئی۔ دنیا کیا؟ بس ریاضی کے چند فارمولے ہیں جو مشینی ضابطے کے ماتحت مصروف حرکت ہیں۔"

(صفحہ ۲۷۰)

آج دنیا کے کسی گوشہ پر بھی نگاہ دوڑا کر دیکھیں۔ انسانی روح پریشان و بے کل نظر آتی ہے۔ ہر ملک۔ ہر شہر اور ہر مقام سے ترقی وارتقاء کے آوازے بلند ہو رہے ہیں۔ ہر ایک حسب مقدور تگ و دو میں مصروف ہے اور صنعت و حرفت۔ تجارت و دولت۔ اور حکومت و سیاست میں دوسروں سے بڑھ جانے کی فکر میں ہے۔ لیکن کیا جو لوگ واقعی ان شعبوں میں رہبر عالم کی حیثیت رکھتے ہیں اپنی موجودہ حالت سے مطمئن ہیں؟ کیا ان کی بے چینی و بے قراری ختم ہو گئی ہے؟ کیا وہ سکھ اور آشتی کی زندگی بسر کرنے لگے ہیں؟ نہیں! کہیں بھی نہیں بلکہ ان میں اضطراب و بے تابی مزید شدت اختیار کر گئی ہے۔ ان کے شب و روز اپنی داغ سوزیوں میں گذر رہے ہیں۔

کہ وہ کس طرح فریقِ ثانی سے پہلے چاند پر پہنچ جائیں یا ایسے طیارے ایجاد کریں جو پلک جھپکنے میں قطب شمالی سے قطب جنوبی تک پہنچ جائیں یا ایسا مہلک بم تیار کریں جو آن واحد میں شہروں کے شہر تباہ کر ڈالے۔ آج ترقی یافتہ دنیا کے یہی اشغال ہیں اور جو غیر ترقی یافتہ گردانے جاتے ہیں۔ وہ ظلمت و پستی کی غاروں میں ہیں۔ MAX EASTMAN اپنی حالات کے پیش نظر تحریر کرتا ہے کہ کوئی زندہ اور باہوش انسان جو ذرا اس امر کا تصور کرے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اس قسم کی دنیا میں ایک ثانیہ کے لئے زندہ رہنا گوارا کرے گا۔ (صفحہ ۲۷)

جب صنعتی و مادی دنیا کے شاہکار انسان کا گلا گھونٹنے لگ جائیں تو انسان کے لئے پر امن و پرسکون زندگی بسر کرنے کا کون سا ٹھکانہ ہے؟ کیا سکون و چین صرف عہد جہالت کی رسوم خلوت نشینی ہی سے مختص ہے؟ کیا ہمیں پھر سے وہی طرز زندگی اپنا لینی چاہیئے جو انسان کے عہد طفولیت کا خاصہ تھی؟ ہم دیکھ رہے ہیں کہ پیشوایان مذاہب (PRIESTS) بھی انسان کے مرض دیرینہ کا علاج نہ کر سکے۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ عہد حاضر کے فلاسفر و سائنسدان بھی اس کا کچھ مداوا نہ کر سکے اور انسانی سعی و جہد کی تاریخ کا ہر ورق اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

حکمائے عہد حاضر آج سرگرداں انسانی المناکیوں کی ان گتھیوں کو سلجھانے کی فکر میں ہیں وہ اس کوشش میں جتنا آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے قلوب و اذہان مزید گتھیوں میں الجھ جاتے ہیں۔ یہاں تک تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ آدم کی شقاوت و مصیبت کا علاج مادیات میں نہیں۔ اخلاقیات میں ہے۔ لیکن وہ اخلاقیات کی دنیا میں بھی کچھ دور ہی جانے پاتے کہ ان کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اور وہ منزل کے راستوں ہی میں گم ہو جاتے ہیں۔ ہر ملک اور ہر قوم کا اپنا اپنا ضابطہ اخلاق ان کی اس امید کو بھی پورا نہیں ہونے دیتا۔ یہ خلیج اس قدر وسیع ہے کہ بعض کے ہاں جو باتیں تہذیب و اخلاق کی جان سمجھی جاتی ہیں دوسروں کے ہاں وہی ستم قابل ہیں۔ چنانچہ اخلاقیات کی اقدار کے پیچ و تاب میں الجھا ہوا MARTIN BUBER اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

"مستقل اقدار کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کرے کہ مستقل قدر کیا ہے۔ ڈان جون کے نزدیک زیادہ سے زیادہ عورتوں کو اپنے فریب میں لے آنا مستقل قدر ہے اور ایک ڈکٹیٹر کے نزدیک قوت کا حصول مستقل قدر۔ مستقل اقدار کو عالمگیر ہونا چاہیئے جسے ہر شخص تسلیم کرے اور ان کا معترف ہو۔" (صفحہ ۱۰۳)

لیکن عالمگیر اقدار کا وضع کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ انسانی عقل و خرد نے اس راہ میں جتنے بھی قدم اٹھائے ہر قدم پر ٹھوکر کھائی۔ تاہم زمانہ اس نقطہ پر پہنچ چکا ہے کہ ان تمام اختلافات کے باوجود اخلاقیات اپنا مطلق وجود ضرور رکھتی ہیں۔ لیکن جب ان اخلاقیات مطلق کی تلاش ہوتی ہے تو پھر ہنوز روز اول والا معاملہ درپیش ہوتا

ہے۔ چنانچہ راشڈل لکھتا ہے۔

"ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون اخلاق اپنا حقیقی وجود رکھتا ہے اور اخلاقیات مطلق ہیں۔ یعنی کوئی ایسی شے ضرور ہے جسے ہم اخلاقی فیصلوں میں صداقت مطلق یا کذب مطلق کہہ سکتے ہیں۔ خواہ ہم یا کہتے ہی اور انسان انھیں ایسا مانیں۔ اخلاقیات سے جو مفہوم ہمارا ہے اس کی بنیاد اسی عقیدہ پر ہے۔ اس قسم کے غیر مشروط۔ وجود فی الخارج مطلق اخلاقی قانون بطور ایک نفسیاتی حقیقت تو ضرور موجود ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کا قانون اخلاق ملیگا کہاں سے؟ یہ قانون کسی انسانی شعور ہی سے تو ملنے سے رہا۔ انسان اخلاقی مسائل کے متعلق الگ الگ نگاہ رکھتا ہے اور اس امر کی ہمارے پاس کوئی خارجی دلیل نہیں کہ دنیا کے تمام انسان کبھی اخلاقیات میں ایک ہی نگاہ رکھیں گے"۔ (صفحہ ۱۵۳)

ان اختلافات کے باوجود یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ایک عالمگیر نظام کی تشکیل کی جائے جس کے اراکین تمام دنیا کے افراد ہوں۔ اگر ایسا ہو بھی جائے کہ تمام اقوام عالم ایک عالمگیر مجلس قانون ساز قائم کرلیں اور وہ ایک نظام ترتیب دے تو بھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ نظام بھی تمام نوع انسانی کے لئے ایک جیسا فائدہ مند ہوگا۔ اس مجلس قانون ساز میں بھی عام مجالس قانون ساز کی طرح قانون کی منظوری آکیا دن ووٹوں کی محتاج ہوگی اور آکیا دن ووٹوں کی منظوری سو کی تمناؤں اور امیدوں کا سہارا نہیں بن سکتی۔ سو ایسی کوشش کے نتائج پیشتر ہی سے ظاہر ہیں۔

لیکن انسانیت کو کسی طرح بھی اس درماندگی میں نہیں چھوڑا جاسکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ جس عالم بسیط میں کوئی سوال بلا جواب نہ ہو ایک اہم جزو عالم بلکہ جانِ عالم کو نامراد و تشنہ کام چھوڑ دیا جائے۔

انسانی مسائل کے حل کرنے کی ذمہ داری دو قسم کے مکاتب فکر پر ہے۔ ایک طرف مذہبی پیشوایان کا جم غفیر اور کتب ہائے گراں بار ہیں۔ دوسری طرف فلاسفروں۔ سائنسدانوں اور سیاست دانوں کے گروہ عظیم کی کوشش ہائے مستحکم ہیں۔ ان دونوں شعبوں نے انسانی مسائل کو مختلف اطراف و انداز سے گھیرا اور ان کی مختلف تعبیریں کیں۔ یہ مفکرین اپنے اپنے راستوں پر اس قدر دور نکل گئے کہ ایک دوسرے سے کچھ ربط و تعلق نہ رہا۔ لیکن ایک قدر مشترک دونوں کی جانگسل اور ہمت شکن کوششوں کا سرمایہ ہے اور وہ ہے خدا کا تصور! صوفی و ملا اپنے انداز سے خدا پر ایمان کا مدعی بنا۔ اور فلاسفر و سائنسداں بھی اپنی تحقیقات میں بے ساختہ بول اٹھا کہ یہ عظیم نظام کائنات کسی منتظم علیم کے دست حسن و قدرت کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس غیر متناہی عالم کو چلانے والی ایک اعلیٰ و برتر ایسی ہستی ضرور موجود ہے جسے ہم خدا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن زیر فلک کوئی گوشہ منکر ایسا نہیں جو خالق کائنات رب العالمین کی ذات سے انکار کرتا ہو سب اس پر متفق ہیں کہ انسان کی مشکلات

کا حل صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اس فاطرِ ارض و سما کی جانب رجوع کیا جائے۔ لیکن مشکل یہ پیدا ہوتی ہے کہ رجوع کی کیا صورت ہو؟ کیا مذہبی رسومات، خانقاہی یا تحقیقاتِ علم و سائنس؟ نہیں۔ اس کا طریقہ صرف یہی ہے کہ پیغامِ خداوندی کو مشعلِ راہ بنا کر زندگی کو اس کے متعین کردہ اصولوں میں منضبط کیا جائے۔ اس کی عطا کردہ مستقل اقدار کو ضابطۂ حیات بنایا جائے۔ اسے مذہبی پیشوایان کے جزدانوں سے نکال کر میدانِ زندگی میں راہبر اور راہ داں مانا جائے۔

آج دنیا مذاہب کی جھوٹی تسلیوں اور سائنس کی مہیب ایجادات سے بدظن و خوفزدہ ہو چکی ہے۔ یہی موقع ہے کہ ہم قرآن کے مستقل اقدار کو لائحۂ عمل قرار دیں، اور عملی طور پر انھیں زندگی میں جاری و ساری کر کے دنیا کو دکھا دیں کہ انسانیت کی بہبودی، خوشحالی اور نشوونما کا راز صرف مستقل اقدار کے احترام اور اطاعت میں ہے اور مستقل اقدار کا سرچشمہ صرف قرآن ہے۔

آج ہم کتنے خوش نصیب ہیں۔ ہمارا دور کتنا بابرکت دور ہے کہ ہمیں علامہ اقبال مرحوم اور محترم پرویز صاحب جیسے مفکروں کی ہمعصری کا شرف حاصل ہے۔ انھوں نے جس نہج و طرز پر قرآن کو سمجھا اور بیان کیا۔ اس سے قرآن کا مقصود و مطلب ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ لہٰذا برادرانِ من۔ میری استدعا ہے کہ ہم ان کی شب بیداریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ محترم پرویز صاحب نے ان ایام میں ہمیں بہت سے حقائق سے بہرہ مند کیا ہے جنھیں وہ وقت کی کمی کی وجہ سے بیان نہیں کر سکے۔ انھیں ان کی تحریروں میں دیکھیں اور انسانیت کو عملی طور پر بتا دیں کہ تیرے مرض کا علاج نہ سائنس کی ترقی میں ہے۔ نہ خانقاہوں کی ریاضتوں میں اور نہ حجروں کی توہم پرستیوں میں۔ اس کا علاج ہے خدا کی زندہ و پائندہ کتاب میں جسے علم و بصیرت کی روشنی میں، عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

والسلام

اسبابِ زوالِ امت از پرویز

مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور ان کا علاج کیا؟ دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے

قیمت: دو روپے

رابطۂ باہمی

(بزمہائے طلوعِ اسلام کی ماہانہ رپورٹوں کا ملخص)

راولپنڈی۔ بزم کے نمائندوں نے کنونشن میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر اور یومِ اقبال کی تقریب کے سلسلہ میں "مقامِ آدم" کے موضوع پر پرویز صاحب کے خطابات ریکارڈ کر لیے تھے۔ انھیں ہفتہ وار اجتماع اور محلہ وار اجتماعات میں سنا گیا۔ اس آسان، خاموش اور موثر ذریعہ تبلیغ کے نتائج نہایت خوشگوار طور پر برآمد ہو رہے ہیں۔ مری میں بزم کے قیام کی کوشش جاری ہے۔ دو ہفتوں تک اس کے باضابطہ قیام کی اطلاع آپ تک پہنچ جائے گی۔

شیخوپورہ۔ بزم نے پندرہ روپے کے پمفلٹ (مع پیامِ فصلِ بہار) بذریعہ ڈاک اور دستی طور پر تقسیم کئے۔ بزم کی رکنیت میں یہاں کے دو معزز احباب نے باضابطہ شرکت فرمائی ہے۔

واہ کینٹ۔ ۳ مئی کو احباب کے ایک اہم اجتماع میں تفسیر سورۂ فاتحہ پر محترم پرویز صاحب کی تقریر کا ریکارڈ سنایا گیا۔ سب نے اسے انتہائی جذب و انہماک سے سنا اور بے حد پسند کیا۔ ریکارڈ کے خاتمے پر پمفلٹ تقسیم کئے گئے جس کے نتیجہ میں دس افراد نے طلوعِ اسلام کی خریداری پر آمادگی ظاہر کی۔ نو نئے افراد خریدار بنائے گئے۔ بزم میں تین نئے احباب نے شمولیت اختیار کی۔ چار احباب نے مزید کتابیں منگوانے کا فیصلہ کیا۔

سید حسین۔ ۸ مئی کے اجلاس میں بائیس پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ طلوعِ اسلام کے مزید پرچوں کے اجراء کا فیصلہ کیا گیا۔

مردان۔ ۸ مئی کی شب کو بزم کا اجلاس ہوا۔ کنونشن کی قراردوں پر اظہارِ اطمینان کیا گیا۔ اور سب نے انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ تمام احباب نے اس عزم کا اعلان کیا کہ کنونشن کی طے کردہ قرارد

کے مطابق وہ آئندہ سال کے لئے تین تین پیشگی خریدار اور تین تین رکن اور تین تین رکن بنانے کی کوشش کریں گے۔

پمفلٹ باقاعدگی سے تقسیم ہو رہے ہیں۔

کوہاٹ۔ محترم محمد جلال صاحب ہیڈ کلرک کو آپریٹیو سوسائیٹیز مردان سے تبدیل ہو کر کوہاٹ آ گئے ہیں۔ طلوع اسلام سے دلچسپی رکھنے والے احباب ہر قسم کا لٹریچر اُن سے حاصل کرنے کے لئے اُن سے رابطہ پیدا کریں۔

کراچی۔ ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ پیام فصل بہار (پرویز صاحب کا خطاب) تقسیم کیا گیا۔ ایک عمدہ ٹیپ ریکارڈ بھی خرید لیا گیا ہے۔ ۷ امئی کو ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن ہال کے ایک اجتماع میں جہاں اراکین بزم کے علاوہ دیگر حضرات کی بہت بڑی تعداد شریک ہوئی، پرویز صاحب کی تقریر ریکارڈ پر سنائی گئی۔ تمام لائبریری حسب معمول باقاعدگی سے چل رہی ہیں اور قارئین ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ایک مزید لائبریری کا افتتاح بھی زیر غور ہے۔

ادارہ طلوع اسلام۔ ٹیپ کے ذریعے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا طریق بڑا موثر اور کامیاب ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ عام کرنا چاہیئے۔ مرکز سے ایسا انتظام کیا جائے گا کہ ریکارڈ شدہ ٹیپ باقاعدگی کے ساتھ متعلقہ بزموں تک پہنچتے رہیں۔

(۲) کنونشن میں پرویز صاحب کا خطاب 'پیام فصل بہار' ملک کے مختلف حلقوں میں بیحد مقبول ہو رہا ہے۔ لاہور کے ہفتہ وار مجلہ 'اقدام' نے پورے کا پورا خطاب اپنی ۷ امئی ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں شائع کیا ہے۔ بزمیں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی طرف توجہ دیں۔

قرآنی فیصلے

روزمرہ زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں؟

پُر از معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے		قیمت چار روپے

نقد و نظر

۱۔ مکتوباتِ اقبال

مارچ ۱۹۵۹ء کے طلوعِ اسلام میں، علامہ اقبالؒ کے انگریزی خطبات کے اردو ترجمہ پر تنقید و تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ اُس ضمن میں محترم سید نذیر نیازی صاحب کا تعارف بھی قارئین سے کرایا جا چکا ہے۔ زیرِ نظر مکتوبات انہی کے مرتب کردہ ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے مکتوبات کے بیشتر مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی جمع و ترتیب کی کیفیت بس اتنی سی تھی کہ لوگوں سے مختلف خطوط اکٹھے کئے گئے اور انھیں یکجا شائع کر دیا گیا۔ ان میں نہ کوئی نظم تھی نہ ترتیب نہ خطوط کا پس منظر نہ مکتوب الیہ کا تعارف۔ نہ اس کی کوئی وضاحت کہ مستفسر نے کیا پوچھا تھا جس کا جواب خط میں دیا گیا تھا۔ نہ اُن علمی و فکری مباحث کی کوئی تشریح جنھیں خطوط میں مجملاً بیان کیا گیا تھا۔ لیکن نیازی صاحب نے زیرِ نظر مجموعہ میں جو انداز اختیار کیا ہے مکاتیبِ اقبال کے دیگر مجموعے تو ایک طرف، ہمارا خیال ہے کہ ہمارے پورے لٹریچر میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ ان خطوط کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں حضرت علامہ مسلسل بیمار رہے۔ آپ لاہور میں تھے اور علاج حکیم عبدالوہاب انصاری مرحوم (حکیم نابینا) کا ہو رہا تھا جو دہلی میں تھے۔ نیازی صاحب بھی ان دنوں دہلی میں تھے اور حضرت علامہ اور حکیم صاحب کے درمیان واسطہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت علامہؒ نے جتنے خطوط نیازی صاحب کو لکھے وہ انھیں محفوظ رکھتے گئے۔ زیرِ نظر مجموعہ (چند متفرق خطوط کے علاوہ) انہی مکاتیب پر مشتمل ہے۔

بظاہر نظر آئے گا کہ ان خطوط میں، جو علامہؒ نے بیماری اور علاج معالجہ کے سلسلے میں لکھے تھے، عام دلچسپی یا افادیت کی کیا چیز ہو سکتی تھی۔ لیکن نیازی صاحب نے جس سلیقہ اور انداز سے انھیں ترتیب دیا ہے اس سے یہ کتاب محض مجموعۂ مکاتیب نہیں رہی بلکہ سنہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک مسلمانانِ ہند کی حیاتِ ملیہ کی مسلسل داستان بن گئی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور پُر از معلومات بھی، شگفتہ و شاداب بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ پھر جہاں جہاں کوئی

علمی، فکری، اور قرآنی نکات آگئے ہیں اور ان کی تشریح بھی ساتھ ساتھ سامنے آگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کچھ وہی شخص کر سکتا تھا جسے ایک طرف اقبالؒ کے ساتھ ایسا گہرا تعلق رہا ہو کہ وہ اگر کسی بات کے متعلق ذرا سا اشارہ بھی کریں تو وہ سمجھ جائے کہ اس سے ان کا مفہوم و مقصود کیا ہے اور دوسری طرف اس کی نگاہ ان تقاضوں پر بھی ہو جو ملت میں اُبھر رہے تھے اور جن کا حضرت علامہ کی فکر و نظر سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق تھا۔ نیازی صاحب کو یہ دونوں خصوصیات حاصل تھیں۔ اس لئے انہوں نے ان خطوط کے گرد ایک ایسی دنیا کی تخلیق کر دی ہے جو کشش و جاذبیت کے متنوع سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ تنوع کی یہ کیفیت ہے کہ ایک خط میں (جو اگست سنہ ۱۹۳۳ء کا رقم فرمودہ ہے)۔ حیات بعد الممات جیسے مشکل مسئلہ کے متعلق گفتگو آگئی ہے (اگرچہ اس میں حضرت علامہؒ نے جو ارشاد فرمایا ہے کہ مرنے والوں سے اس زندگی میں اتحاد ممکن ہے اسی طرح جس طرح ہم آپس میں ملتے جلتے ہیں؛ ہمیں اس کی تائید میں قرآنی سند نہیں ملتی)۔ تو دوسرے خط میں (جو ستمبر سنہ ۱۹۳۴ء کا تحریر فرمودہ ہے) اپنی بیماری کے علاج کے سلسلہ میں یہ بھی تحریر ہے کہ

> ایک شخص جو خود اس بیماری کا مریض رہ چکا ہے۔ عراق میں اسے ایک ترک طبیب نے تمباکو میں چرس رکھ کر پلائی تھی اور اس کے ساتھ لیمن چائے جس میں شکر کی جگہ گُڑ ڈالا جائے۔ اس نسخے سے اُسے فائدہ ہوا ...... حکیم صاحب سے اس کا ذکر کریں کہ آیا چرس کا استعمال آواز کے لئے مفید ہے۔

پھر اگر وہ ایک طرف حکیم صاحب سے سبزی۔ ترکاری۔ پھل پھول۔ گوشت۔ چاول۔ پلاؤ۔ کھانے کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ

> حکیم صاحب سے عرض کیجئے گا کہ مجھے نماز کا پورا پابند کرنے اور سحر خوری کی عادت ڈالنے کے لئے آپ کے روحانی اثر کی ضرورت ہے۔

انہی خطوط میں ہمیں اس قسم کی چیزیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً

> ترک شاہی کی کاٹری میں سرہند شریف جا رہا ہوں۔ چند روز ہوئے صبح کی نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے مندرجہ ذیل پیغام دیا۔ "ہم نے جو خواب تمہارے اور شکیب ارسلان کے متعلق دیکھا ہے وہ سرہند بھیج دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم پر بہت فضل کرنے والا ہے۔
>
> (جون سنہ ۱۹۳۴ء)

اور یہ بھی کہ

> مالی مشکلات کا فکر نہ کیجئے کہ یہ کبھی آتی ہیں اور کبھی خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ بسا اوقات انسان کو بظاہر اس کے حق میں مضر بنا دیتے ہیں یہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کی سعی کو اس میں بہت کم

دخل ہے۔ (نومبر ۱۹۳۵ء)

کتاب کے آخر میں (اشاریہ سے پہلے) مؤلف نے "خاتمۂ سخن" کے عنوان سے مختلف موضوعات پر مختصر سے شذرات لکھے ہیں۔ جو دلچسپ ہونے کے علاوہ بڑے پُراز معلومات ہیں۔ ان میں "طلوع اسلام" کا بھی ذکر آگیا ہے۔ نیازی صاحب نے "طلوع اسلام" کے نام سے ایک ماہوار مجلہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں دہلی سے جاری کیا تھا۔ اس کے بعد وہ پرچہ لاہور میں منتقل ہوگیا۔ لیکن (۱۹۳۸ء میں) جب کہ اس کے کل چھ پرچے شائع ہوئے تھے، وہ بند ہوگیا۔ موجودہ طلوع اسلام اپریل ۱۹۳۸ء میں نئے انتظامات کے تابع شائع ہوا۔ اس کا سابقہ طلوع اسلام کے ساتھ (اشتراکِ رسمی کے علاوہ) کوئی تعلق نہیں تھا۔ نیازی صاحب نے اپنے شذرہ میں اس حقیقت کی وضاحت فرمائی ہے۔ لیکن آخر میں لکھا ہے۔

یہ ایک جداگانہ اور نیا طلوع اسلام تھا۔ حضرت پرویز اور ان کی جماعت کے خیالات کا حامل۔

یہ "نیا طلوع اسلام" بھی پیامِ اقبال کا ترجمان اور قرآنی تعلیم کا پیامبر تھا (اور ہے)۔ پرویز صاحب اُسی پیام اور تعلیم کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ باقی رہی "ان کی جماعت" سو انھوں نے جماعت نہیں بنائی۔ وہ جماعت سازی کے خلاف ہیں۔ بہرحال یہ بات ضمناً سامنے آگئی تھی جس کی وضاحت ضروری سمجھی گئی۔

ہم محترم نیازی صاحب کو ان کی اس کامیاب کوشش پر مستحق تبریک سمجھتے ہیں۔ اور ان سے زیادہ قابلِ مبارکباد اقبال اکاڈیمی (کراچی) کو جنھیں اس کتاب کی اشاعت کا شرف حاصل ہوا۔ اس سے پہلے ان کے ہاں سے جو کچھ شائع ہوتا رہا، جو کچھ اقبال کے نام سے کرتے رہے، وہ بالعموم اکاڈیمی کے وجود کی علامت تو کہلا سکتا تھا، اس کے جواز کی دلیل نہیں قرار پاسکتا تھا۔ ہمیں زیرِ نظر کتاب کے گردپوش پر شائع شدہ اعلان سے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اکاڈیمی حضرت علامہؒ سے متعلق محترم نیازی صاحب کی دیگر تالیفات بھی شائع کر رہی ہے۔ بالخصوص ان کی "ڈائری" جس میں انھوں نے ان "باتوں" کو جمع کر رکھا ہے جو حضرت علامہ کی محفل میں ہوا کرتی تھیں اور جن میں مؤلف بھی شریک ہوتے تھے۔ جن خوش بخت افراد کو حضرت علامہ کی شام کی ان محفلوں میں شرکت کا موقع ملا ہے وہ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان محفلوں کی جو روئداد نیازی صاحب نے مرتب کی ہوگی وہ کیا چیز ہوگی۔ ہمیں اس کی اشاعت کا شدت سے انتظار رہیگا۔ زیرِ نظر کتاب قریب چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور اقبال اکاڈیمی کراچی سے مل سکتی ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

۲۔ مقدمۂ تاریخ سائنس — یہ کتاب سید نذیر نیازی صاحب کی کوہ کنی اور جسّے شیر لانے کی بیّن شہادت ہے۔ جارج سارٹن کی ایک شہرۂ آفاق اور ضخیم کتاب ہے

جس کا نام ہے (INTRODUCTION TO THE HISTORY OF SCIENCE) یعنی مقدمہ تاریخ سائنس۔ سائنس سے اس کی مراد صرف فزکس اور کیمسٹری ہی نہیں۔ اس سے مفہوم ہے "مرتب و منظم قطعی اور اثباتی علم" یعنی ہر اثباتی علم (POSITIVE KNOWLEDGE) جس کی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ نشوونما ہوئی ہو خواہ وہ خارجی کائنات اور انسانی زندگی کے کسی گوشے سے متعلق ہو، دنیا کی کسی قوم میں اس کی نشوونما ہوئی ہو۔ اور تاریخ کے کسی دور سے اس کا تعلق ہو۔ سائنس کے اس مفہوم کو سامنے رکھیے اور پھر سوچئے کہ سارٹن کے پیش نظر مہم کیا تھی؟ اس کی اس تاریخ کا مقدمہ دو ضخیم جلدوں میں (انگریزی میں) شائع ہوا تھا (جلد دوم کے دو حصے ہیں) اس میں اس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں علوم و فنون کی ترقی سے بحث کی ہے اور ان ارباب علم و حکمت کا تعارف کرایا ہے جنہوں نے ان علوم و فنون کے نشوونما و ارتقاء میں حصہ لیا۔ یہ ہے وہ کتاب جس کی جلد اول کے تیسرے حصہ کا ترجمہ زیر تبصرہ کتاب کے قریب چھ سو صفحات میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ہومر سے عمر خیام تک کا زمانہ آگیا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ، فاضل مترجم نے جو حواشی دیئے ہیں وہ ان کی وسعت معلومات اور علمی تبحر کے آئینہ دار اور مصنف کے جن خیالات پر وہ ساتھ ساتھ گرفت کرتے چلے جاتے ہیں وہ ان کی تیزنگہی اور صحیح اور غلط میں امتیاز کی صلاحیت کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ شروع میں مترجم کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے جس میں کتاب پر عمومی انداز سے تنقید کی گئی ہے۔ یہ مقدمہ بجائے خویش اس قدر بلند پایہ ہے کہ اس سے مترجم کی علمی حیثیت مسلّم طور پر سامنے آجاتی ہے۔ ہمارے ملک میں کئی ایک علمی اور تحقیقاتی ادارے ہیں جو حکومت کی امداد پر چل رہے ہیں۔ کس قدر مقام تاسف و حیرت ہے کہ قوم کا لاکھوں روپیہ ان اداروں پر صرف ہو رہا ہے اور نیاز کی صاحب جیسے گراں بہا جوہریوں ضائع ہو رہے ہیں۔ قومیں، دولت کی کمی سے تباہ نہیں ہوا کرتیں۔ وہ تباہ ہوتی ہیں دولت کے غلط مصرف سے۔ ہماری رائے میں، ہمارے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب، مجلس ترقی ادب، لاہور نے ٹائپ میں شائع کی ہے۔ اور مجلد کی قیمت دس روپے ہے جو زیادہ نہیں۔ کیا ہم مجلس مذکور سے اس کی توقع رکھیں کہ وہ اس ترجمہ کے باقی حصے بھی اسی طرح شائع کریگی؟

۳۔ تاریخ اسلام۔ حصہ سوم

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (مرحوم) کی تاریخ اسلام کی پہلی دو جلدوں پر طلوع اسلام میں (مدت ہوئی) تبصرہ آچکا ہے۔ اب اس کی تیسری اور آخری جلد موصول ہوئی ہے جس میں اندلس (ہسپانیہ) پر مسلمانوں کی حکومت کے تفصیلی بیان کے علاوہ، مراکش کی سلطنت اور سیسیلیہ، مصر کی دولت عبیدین، دولت قرامطہ، مغولان چنگیزی اور سلطنت عثمانیہ کے حالات آگئے ہیں۔ دیگر کوائف کے علاوہ، صرف اندلس کی تاریخ جو اہمیت رکھتی ہے۔ بس سے اس حصہ

کی افادی حیثیت سامنے آجاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب بڑی مقبول ہوگی۔ نفیس اکیڈیمی، کراچی نے اسے حسنِ اہتمام سے شائع کیا ہے۔ بڑے سائز کے قریب چھ سو صفحات۔ طباعت، کتابت، کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد بارہ روپے (مکمل سیٹ تینوں حصوں کی قیمت چھتیس روپے)

۴۔ آئینہ حقیقت نما

مولانا اکبر شاہ خاں (مرحوم) کی مورخانہ تحقیق بڑی خاص چیز اور نگاہ دور رس تھی۔ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کو غیر مسلم مورخین نے جس انداز میں پیش کیا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ حکمراں بھی فرشتے نہیں تھے۔ لیکن بیشتر حالات میں انھیں محض تعصب کی بنا پر مطعون کیا گیا ہے۔ مولانا مرحوم نے محمد بن قاسم کے حملے کے وقت سے لے کر خاندانِ تغلق تک کی تاریخ کو محققانہ نگاہ سے پرکھا اور ان اتہامات کی تردید کی ہے جو اس دور کے مسلمان حکمرانوں کے سر تھوپے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ان کے ہر ایک نتیجۂ فکر سے متفق ہوا جائے لیکن مصنف مرحوم نے جس کاوش اور دیدہ ریزی سے یہ کام کیا ہے۔ اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اس میں بڑا تاریخی سرمایہ آگیا ہے اس کتاب کو بھی نفیس اکیڈیمی (کراچی) نے عمدگی سے شائع کیا ہے۔ ضخامت سوا چھ سو صفحات۔ قیمت مجلد بارہ روپے

۵۔ تاریخ آزاد پٹھان (جلد دوم)

محترم اللہ بخش یوسفی صاحب کی کتاب "تاریخ آزاد پٹھان" کی جلد اول پر طلوعِ اسلام کے صفحات میں تبصرہ ہو چکا ہے اب اس کی جلد دوم پیشِ نظر ہے۔ اس میں انھوں نے تمہید و تعارف کے بعد (جو قریب پچاس صفحات پر مشتمل ہیں) درہ کوہاٹ کی تاریخ بیان کی ہے۔ اسی سلسلہ میں قبائلیوں کی خانہ جنگی، شیعہ سنی مناقشات۔ پاکستان کا پس منظر اور قیام نیز گول میز کانفرنس جیسے عنوانات کا بھی مختصر طور پر تذکرہ آگیا ہے۔ اس کے بعد قریب بیس صفحات میں اورکزئی اور بنگش قبائل کے حالات سامنے لائے گئے ہیں۔ یوں یہ کتاب چھوٹے سائز کے قریب دو صد صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ کتاب میں کئی ایک تصاویر بھی ہیں۔ قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ۔ محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی۔ اقبال کالونی۔ کراچی نمبر ۵

۶۔ نقوش کا طنز و مزاح نمبر

ماہنامہ "نقوش" (لاہور) نے اپنے خاص نمبروں کی اشاعت میں انفرادیت پیدا کرلی ہے۔ زیرِ تبصرہ نمبر ساڑھے سو صفحات سے زیادہ پر پھیلا ہوا ہے اور اردو ادب میں طنز و مزاح کی تاریخ اور مقام کے لئے وقف ہے۔ حسبِ سابق اس خصوصی اشاعت کی جمع و ترتیب میں بھی بڑی کوہکنی اور صحرا نوردی سے کام لیا گیا ہے۔ اور اس موضوع پر اچھا خاصا مسالہ جمع کردیا گیا ہے۔ اس خاص نمبر کی قیمت دس روپے ہے اور ادارہ فروغِ اردو، لاہور سے مل سکتا ہے۔

مولانا آزاد کی آخری کتاب

INDIA WINS FREEDOM

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)

انگریزی زبان کی یہ کتاب مشتمل ہے مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے مختصر سوانح حیات پر اور ان کارناموں کے مقابلۃً تفصیلی بیان پر جو انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی کشمکش کے دوران سرانجام دیئے۔ کتاب کے مرتب مسٹر ہمایوں کبیر نے پیش لفظ میں کتاب کی ترتیب و تسوید کی داستان بھی بیان کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ قریب دو سال تک ان کا معمول رہا کہ وہ ہر شام ایک گھنٹہ کے قریب مولانا آزاد کے ساتھ بسر کرتے۔ مولانا اپنی داستان زبانی بیان کرتے اور ہمایوں کبیر صاحب اس کے نوٹ لیتے جاتے۔ اس کے بعد وہ اس داستان کو (انگریزی زبان میں) ترتیب دیتے۔ اس طرح جب اس کتاب کا مسودہ تیار ہو گیا تو مولانا آزاد نے اس کا ایک ایک فقرہ پڑھا۔ اور یوں اسے ان کی تصویب و توثیق حاصل ہو گئی۔ مولانا آزاد نے فیصلہ کیا کہ کتاب کے قریب تیس صفحات سردست شائع نہ ہوں، چنانچہ ان صفحات کو نیشنل لائبریری کلکتہ اور نیشنل آرچایوز نئی دہلی میں سربمہر لفافوں میں رکھ دیا گیا۔ بقایا مسودہ زیرِ نظر کتاب کی شکل میں ہندوستان میں شائع ہوا ہے (پاکستان میں یہ کتاب غالباً فروخت کے لئے نہیں آئی)

کتاب کا مطالعہ جو مجموعی نقوش پڑھنے والے کے دل پر چھوڑتا ہے۔ انھیں مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ

(۱) اگر دو ایک مقامات پر اس قسم کا تذکرہ ضمنی اشارات میں نہ آجاتا تو کسی ناواقف کو پتہ نہ چل سکتا کہ کتاب کسی مسلمان کی لکھی ہوئی ہے یا غیر مسلم کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وطنی قومیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے انسان کی کیفیت ایسی ہی ہونی چاہیئے۔ اس نقطۂ نگاہ سے مصنف اپنی تصنیف میں کامیاب ہے۔

(۲) مصنف ہر مقام پر اپنی انفرادیت کو نمایاں طور پر محسوس کرانا چاہتا ہے۔ وہ بتانا چاہتا ہے کہ ہندوستان میں اس سے بہتر سیاست داں کوئی نہیں تھا چنانچہ جن معاملات میں اس کے رفقائے کار کو اس کی رائے سے اختلاف ہوتا ہے اور فیصلہ مصنف کی رائے کے خلاف ہوتا ہے۔ مصنف بتاتا ہے کہ آخرالامر واقعات ثابت کر دیتے کہ اس کی رائے صحیح اور باقیوں کی رائے غلط تھی۔

(۳) مصنف کے دل میں ایک پھانس ہے جو اسے کسی پہلو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ وہ پھانس ہے مسٹر جناح

کا تصور۔ پوری کتاب میں نظر آتا ہے کہ جناح مصنف کے اعصاب پر سوار ہے اور اس کے خلاف آتشِ انتقام مصنف کو طلسم پیچ و تاب بنائے ہوئے ہے۔

(۴) مصنف کی زندگی ایک عظیم المناک حادثہ سے دوچار ہوئی۔ جس کی یاد اسے آخری دم تک ستاتی رہی یہ المناک حادثہ تھا ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام۔ اس سے ہندوستان کو جس قدر نقصان پہنچا ہے وہ اس پر خون کے آنسو روتا ہے۔

(۵) مصنف یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں شروع سے آخر تک ایک ہی مسلک کا پیرو اور ایک ہی اصول کا پابند رہا ہے۔ یعنی نیشنلزم اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ان لوگوں کے دل میں مصنف کا کوئی احترام باقی نہیں رہ سکتا جو اس کی پوری زندگی سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ اس کے پہلے دور (دورِ الہلال) اور دوسرے دور (کانگریسی دور) میں کس قدر تضاد و تخالف تھا۔

(۶) مصنف اپنے رفقائے کار میں سے کسی پر بھی تنقید سے نہیں جھجکتا۔ حتیٰ کہ گاندھی۔ پٹیل۔ جواہر لال جیسی شخصیتیں بھی اس سے مامون نہیں رہیں۔ لیکن اس تنقید سے مقصود مصنف کا اپنی برتری کا اثبات ہوتا ہے۔

(۷) مصنف اسلام کے مستقبل سے مایوس تھا اور اسے ایک "چلے ہوئے کارتوس" سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔

ہم ان نقاط میں سے بعض کے متعلق کچھ تفصیلاً کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔

قائدِ اعظم کے خلاف

جب کانگریس نے متحدہ ہندوستان میں پہلے پہل وزارتیں قائم کیں تو مختلف مقامات میں مسلمانوں پر بہت سے مظالم ہوئے تھے۔ اس پر مسلم لیگ نے ایک انکوائری کمیٹی (مجلسِ تحقیقات) متعین کی تھی جس نے اس ظلم و تشدد کے بہت سے واقعات کو بے نقاب کیا تھا۔ اس کے متعلق مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

> میں ذاتی علم کی بنا پر ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے جو الزامات عائد کئے تھے۔ وہ کلیۃً جھوٹے تھے۔ (ص۲۲)

اس کا ثبوت کیا ہے؟ وہ لکھتے ہیں

> مگر ان الزامات میں صداقت کا ایک ذرہ بھی ہوتا تو میں خود دیکھتا کہ ظلم کی تلافی ہو جائے۔ میں تو ایسے مسئلہ پر مستعفی ہو جانے کو تیار تھا۔ (ص۲۲)

یعنی قائدِ اعظم کا تعارف یہ کہہ کر کرایا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے خلاف الزامات لگانے میں سفید جھوٹ بولتے تھے۔

(۲) مسٹر گاندھی نے ایک مرتبہ قائدِ اعظمؒ کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت کی کوشش کی تھی۔ اس واقعہ کو بیان

کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

> میرا خیال ہے کہ ایسے موقعہ پر گاندھی جی کا مسٹر جناح کی طرف قدم بڑھانا ایک بہت بڑی سیاسی حماقت تھی۔ اس سے مسٹر جناح کو ایک نئی اہمیت حاصل ہو گئی جس کا اس نے آگے چل کر پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جناح کے معاملہ میں گاندھی جی کا طرزِ عمل شروع ہی سے عجیب و غریب رہا تھا۔ مسٹر جناح کانگریس سے الگ ہو کر اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ لیکن گاندھی جی کے سلبی اور ایجابی اقدامات نے مسٹر جناح کو اس کی کھوئی ہوئی اہمیت واپس دلا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر گاندھی جی کا طرزِ عمل ایسا نہ رہتا تو مسٹر جناح اپنی شہرتِ رفتہ کو شاید دوبارہ حاصل نہ کر سکتے تھے۔ مسلمانوں کا ایک کثیر حلقہ مسٹر جناح اور ان کی پالیسی کے متعلق شکوک و شبہات رکھتا تھا۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ گاندھی جی مسٹر جناح کے پیچھے پیچھے بھونڈے بھاگے پھر رہے ہیں اور ان کی منت خوشامد کر رہے ہیں، تو ان میں سے اکثر کے دل میں مسٹر جناح کے لئے جدید عزت اور عقیدت پیدا ہو گئی۔
>
> (صفحہ ۹۲)

مسٹر جناح کے لئے "قائدِ اعظم" کے لقب کے ضمن میں مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

> میں اس مقام پر یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ یہ بھی گاندھی جی ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے مسٹر جناح کے لئے "قائدِ اعظم" کے خطاب کی ترویج کی۔ گاندھی جی کے آشرم میں امتِ اسلام نامی ایک سادہ اور نیک نیت خاتون تھی۔ اس نے بعض اردو اخبارات میں مسٹر جناح کا خطاب "قائدِ اعظم" دیکھا تھا۔ جب گاندھی جی مسٹر جناح کو ملاقات کا خط لکھنے لگے تو اس خاتون نے گاندھی جی سے کہا کہ اردو اخبارات مسٹر جناح کو قائدِ اعظم کہہ کر پکارتے ہیں اس لئے آپ بھی انھیں اسی لقب سے مخاطب کریں گاندھی جی نے یہ سوچے بغیر کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا مسٹر جناح کو "قائدِ اعظم" لکھ دیا۔ یہ خط بعد ازاں اخبارات میں بھی شائع ہو گیا۔ جب ہندی مسلمانوں نے دیکھا کہ گاندھی جی بھی مسٹر جناح کو قائدِ اعظم کہہ کر پکارتے ہیں تو انھوں نے سمجھا کہ مسٹر جناح واقعی "قائدِ اعظم" ہوں گے۔ جب میں نے جولائی ۱۹۴۴ء میں اخبارات میں یہ رپورٹ پڑھی کہ گاندھی جی مسٹر جناح کے ساتھ سلسلۂ خط و کتابت شروع کرنے والے ہیں تو میں نے اپنے رفقا سے کہا کہ گاندھی جی بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ (صفحہ ۹۳)

مسلم لیگ

یہ تو رہے مصنف کے خیالات "قائدِ اعظمؒ" کے متعلق۔ مسلم لیگ کے متعلق ان کے خیالات بھی کچھ کم تلخ نہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ اپنے اس کارنامہ کو بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے پنجاب میں مسلم لیگ منسٹری قائم نہ ہونے دی اور اس کی جگہ ملک خضر حیات خاں کو وزیرِ اعظم بنا دیا جو کانگریس کے

زیر اثر تھے۔ انھیں گلہ ہے کہ ان کے رفقاء ان کی اس خدمتِ جلیل کے معترف نہ ہوئے۔ (ص [illegible])

دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ جب یو پی میں تشکیلِ وزارت کا وقت آیا تو انھوں نے نواب اسمٰعیل خاں اور چوہدری خلیق الزمان کو راضی کر لیا کہ اگر انھیں وزارت میں لے لیا جائے تو مسلم لیگ اور کانگریس کی مشترکہ وزارت بن جائے گی۔ لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ انھوں نے ان حضرات سے کہہ دیا کہ ان میں سے صرف ایک کو وزارت میں لیا جا سکتا ہے۔ اس پر وہ بگڑ گئے اور یوں مشترکہ وزارت نہ بن سکی۔

> یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہوئی۔ اگر یو پی لیگ کی تعاون کی پیشکش کو قبول کر لیا جاتا تو عملی طور پر مسلم لیگ پارٹی کانگریس میں مدغم ہو کر رہ جاتی۔ جواہر لال کے اقدام نے یو پی میں مسلم لیگ کو نئی زندگی بخش دی۔ سیاست کے سب طالب علم جانتے ہیں کہ یہ یو پی ہی تھا جہاں سے مسلم لیگ کی تنظیم نو کی ابتداء ہوئی تھی۔ مسٹر جناح نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ایسا جارحانہ اقدام شروع کر دیا جو تشکیلِ پاکستان پر منتج ہوا۔ (ص [illegible])

ملک کی تقسیم — پاکستان کی تشکیل

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، ہندوستان کی تقسیم — یعنی پاکستان کی تشکیل — وہ حادثۂ فاجعہ ہے جس کی الم انگیزیوں سے مصنف جانبر نہیں ہو سکا۔ اس کی کتاب کا آخری حصہ اسی المیہ کی نذر ہو گیا ہے۔ وہ اسے "ٹریجڈی" سے تعبیر کرتا ہے (ص [illegible]) اور لکھتا ہے کہ

> جب مجھے معلوم ہوا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن تقسیمِ ملک کے متعلق سوچ رہا ہے۔ اور اس نے جواہر لعل اور پٹیل کو بھی اس پر رضامند کر لیا ہے تو مجھے اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ (ص [illegible]) جب پٹیل نے کہا کہ ملک میں واقعی دو قومیں آباد ہیں — یعنی ہندو اور مسلمان — تو مجھے اس پر سخت حیرت ہوئی۔ حالانکہ یہ محض مسٹر جناح کا تخلیق کردہ سلوگن تھا (ص [illegible]) میں نے جواہر لال کو متنبہ کیا تھا کہ اگر ہم تقسیم پر رضامند ہو گئے تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ گاندھی جی شروع میں تقسیم کے خلاف تھے لیکن جب انھوں نے بھی اس پر ہاں کر لی تو میں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں ان سے کہا کہ اگر آپ کے بھی یہی خیالات ہیں تو میں ہندوستان کو تباہی سے بچانے کی کوئی شکل نہیں دیکھتا (ص [illegible]) میں نے گاندھی جی سے یہ بھی کہا کہ اگر اس فیصلہ کو دو ایک سال تک ملتوی کر دیا جائے تو مجھے امید ہے کہ مسلم لیگ ہمارے ساتھ سمجھوتا کرنے پر رضامند ہو جائے گی (ص [illegible])

لیکن اس کے باوجود پاکستان بن گیا۔ مصنف نے اپنی کتاب کے اس باب کا عنوان

ایک خواب کا خاتمہ

تجویز کیا ہے۔ یعنی وہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کا محکوم بنانے کا جو خواب دیکھ رہے تھے (تشکیل پاکستان سے اس خواب کا خاتمہ ہو گیا۔

خواب کا تو خاتمہ ہو گیا۔ لیکن مولانا آزاد کی کوششیں پھر بھی جاری رہیں۔ چنانچہ انھوں نے پہلے یہ کوشش کی کہ کسی طرح فوج کی تقسیم نہ ہو۔ (صفحہ ۲۰۱) انھیں اس بات کا صدمہ ہے کہ ان کے رفقاء نے اس باب میں ان کا ساتھ نہ دیا۔ (صفحہ ۲۰۲) یہاں سے ناکامی ہوئی تو انھوں نے کوشش کی کہ ملازمین کی تقسیم فرقہ وارانہ طریق پر نہ ہو۔ (صفحہ ۲۰۳)۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تقسیم کے متعلق لیگ کا اصرار کس قدر حماقت پر مبنی تھا۔ مسلم ملازمین کے سلسلہ میں لیگ کا طرز عمل اسی حماقت کی ایک اور مثال تھی۔ (صفحہ ۲۰۲)

یہ ہیں مصنف کے خیالات، قائد اعظم، مسلم لیگ، اور پاکستان کے متعلق۔

پختونستان

تقسیم کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے بعض باتیں ایسی بھی لکھی ہیں جو بڑی دیدہ کشا ہیں۔ ان میں سے پہلی بات خان عبدالغفار خاں اور ان کی تحریک پختونستان کے متعلق ہے وہ لکھتے ہیں کہ

جب ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں گاندھی جی نے بھی تقسیم ملک کی تجویز کی حمایت کر دی تو خان عبدالغفار خاں کی حالت قابلِ دید تھی۔ وہ سکتہ کے عالم میں ڈوب گئے وہ ساکت و صامت بیٹھے تھے۔ ان کی زبان پر ایک لفظ تک نہ آتا تھا۔

اس کے بعد انھوں نے کانگریس کے تمام بڑے بڑے لیڈروں سے پرزور اپیل کی کہ وہ ایسا فیصلہ نہ کریں۔ انھوں نے ان سے کہا کہ

اگر کانگریس نے تقسیم کا فیصلہ کر کے خدائی خدمت گاروں کو بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا تو صوبہ سرحد اسے غداری قرار دے گا۔ (صفحہ ۱۹۳)

جب ان کی کوئی اپیل نہ سنی گئی اور معاملہ ریفرنڈم تک آپہنچا تو ڈاکٹر خان صاحب (مرحوم) نے کہا

اگر ریفرنڈم ہونا ہی ہے تو پٹھانوں کو اس کی بھی آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ (ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ رہنے کے بجائے) اپنی آزاد مملکت پختونستان کے حق میں رائے دے سکیں۔ (ص [illegible])

مولانا آزاد کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ پختونستان سے ان حضرات کی مراد ہندوستان اور پاکستان سے الگ ایک آزاد مملکت تھی۔ ان کے الفاظ ہیں۔

A FREE PATHAN STATE (P. 195)

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ جب ملک کی تقسیم ہوگئی اور پاکستان وجود میں آگیا۔ تب خان برادرز نے اپنے مطالبہ "پختونستان" میں تبدیلی کی اور کہا کہ اس سے ان کی مراد "ایک آزاد مملکت" نہیں بلکہ خود مختار صوبہ ہے (ص ۱۹۵)

کانگریسی لیڈر

دوسری اہم بات جو اس سلسلہ میں مصنف نے کہی ہے یہ ہے کہ

یہ بات مجھ پر اس وقت بھی واضح تھی کہ کانگریسی لیڈروں نے ملک کی تقسیم کو بطیب خاطر قبول نہیں کیا۔ بعض نے اسے محض غصے میں آکر قبول کیا۔ اور بعض نے مایوس ہوکر۔ (ص ۲۰۷)

دورِ الہلال اور اس کے بعد

اب ہم اس حصے کی طرف آتے ہیں جس میں مصنف نے کہا ہے کہ دورِ الہلال کے زمانہ میں بھی نیشنلزم کا مبلغ تھا (ص ۔)۔ نیشنلزم کے معنی یہ ہیں کہ قومیت کی تشکیل اشتراکِ وطن کی بناء پر ہوتی ہے نہ کہ آئیڈیالوجی (دین) کے اشتراک کی بناء پر۔ وطن کی بناء پر قومیت کے نظریہ کی رُو سے ہندوستان میں بسنے والے ہندو مسلم سب ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ اس کے برعکس آئیڈیالوجی کی بناء پر تشکیل قومیت کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں۔ یہ وہ اصول تھا جس کی بناء پر پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ مولانا آزاد اور ان کے ہم نوا اس کی مخالفت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قومیت کا مدار وطن پر ہے۔ مذہب کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ مولانا آزاد نے اپنی کتاب میں اس کا دعویٰ کیا ہے کہ وہ شروع ہی سے اسی مسلک کے داعی تھے اور الہلال کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ الہلال اور البلاغ کے اوراق اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ مولانا آزاد ایک مبسوط مقالہ میں اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ حضرات انبیائے کرام ایک ایسی قومیت کی تشکیل کے لئے آتے تھے جو نسل۔ وطن۔ رنگ۔ زبان وغیرہ کے امتیازات مٹا کر خالص روحانی امتیاز کی بناء پر ایک نئی قومیت کی تشکیل کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں۔

انبیاء کی دعوت

انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائقِ نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ انبیائے کرام کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازاتِ قدیمہ کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔ پس اس بناء پر ان کی دعوت کا اولین اسوۂ حسنہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ خود بھی نسل و خاندان کے تمام رشتوں کو توڑ دیں اور اس طرح نسلی قربانی کا طاقتور حربہ تیار کریں۔ اس قربانی کا اثر ان کے تمام کاروبارِ دعوت میں سب سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ کس طرح داعیٔ الی الحق نے اپنے تمام رشتوں کے گھر کو اجاڑ دیا اور اس عمارت کا ایک گوشہ بن گیا جس کی چھت کے نیچے ہمیں جگہ دے رہا ہے۔ چنانچہ انبیائے کرام و رسلِ عظام کے اس

سلسلہ میں جن جن سے نئی قومیتوں کی بنیاد رکھی ہے۔ سب سے پہلے حضرت نوحؑ کی دعوت کا مقام ہے؟ اسی سلسلہ میں ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

نئی قومیت

"یہ دراصل اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی دعوت کسی خاص نسل اور قوم کو زندہ کر دینے کے لئے نہ تھی بلکہ وہ اس قسم کی دعوت میں داخل تھی جو موجودہ نسلوں اور قوموں سے بالاتر ہو کر خود ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے اور اس کی بنیاد محض اخوۃِ دینی پر قائم ہوتی ہے پس وہ جغرافیہ و نسل سے علیحدہ ہو کر ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے۔ اور زمین کا ہر ٹکڑا نوعِ انسانی کا ہر حصہ۔ اقوام و ملل کی ہر نسل اس کے دامن میں پناہ لے سکتی ہے۔ (البلاغ ۱۱ ۱۲ / ۱۹۱۵)"

الہلال کے ایک مقالہ میں جو دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء کو شائع ہوا تھا۔ مولانا آزاد مسئلہ قومیت کے متعلق لکھتے ہیں

دین کی بنیاد پر قومیت

"انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی کہ اس نے رشتۂ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لیے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لئے تھی قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا۔ لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اتحاد و اخوت کی دعوت دی۔ اور کہا کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔

اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا۔ اس لئے کہ باہم پہچانے جاؤ۔ ورنہ دراصل یہ تفریق و انتساب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں۔ امتیاز اور شرف اسی کے لئے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔

پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے "وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ" لیکن وہ اس کو کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے۔ پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۝

بے شک تمہاری جماعت ایک ہی امت ہے اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں۔

اے برادران ملت! یہی اسلام کی وہ عالمگیر اخوت اور دعوت اسلام کی وحدت تھی جس نے زمین کے دور دراز گوشوں کو ایک کر دیا تھا۔ اسلام نے ریگستان حجاز میں ظہور کیا مگر صحرائے افریقہ میں اس کی پکار بلند ہوئی۔ اس کی دعوت کی صدا جبل بوقبیس کی گھاٹیوں سے اٹھی۔ مگر دیوار چین سے صدائے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللہ کی بازگشت گونجی۔ تاریخ کی نظر میں جس وقت دجلہ و فرات کے کنارے پیروان اسلام کے نقش قدم گن رہی تھیں، عین اسی وقت گنگا اور جمنا کے کنارے سیکڑوں ہاتھ تھے۔ جو خدائے واحد کے آگے سربسجود ہونے کے لئے وضو کر رہے تھے۔ وہ تمام دنیا کی مختلف قومیں، زمین کے دور دراز گوشوں پر بسنے والی آبادیاں گویا ایک ہی گھر کے عزیز تھے جن کو شیطان رجیم کی تفرقہ اندازیوں نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ لیکن خدائے رحیم نے ان صدیوں کے بچھڑے ہوئے دلوں کو ایک دائمی صلح کے ذریعے پھر ایک جگہ جمع کر دیا۔ اور ان کے روٹھے ہوئے دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے ملا دیا کہ تمام پچھلے شکوے اور شکایتیں بھول کر ایک دوسرے کے بھائی اور شریک رنج و راحت ہو گئے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۝ (۳:۱۰۳)

اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو، جو تم پر نازل کی گئی، جبکہ تم اسلام سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ مگر اسلام نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت پیدا کر دی، اور دشمن کی جگہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔

یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا۔ بمجرد اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ مصری ہو، خواہ الجیریا کا وحشی ہو۔ خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندان توحید کا عضو ہے۔ جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک باپ اپنے لڑکے سے روٹھ جائے۔ بعید نہیں کہ ایک ماں اپنی گود سے بچے کو الگ کر دے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے تمام عہد مودت۔ خون اور نسل کے باندھے ہوئے پیمان وفا و محبت ٹوٹ جائیں۔ مگر جو رشتہ ایک چین کے مسلمان کو افریقہ کے مسلمان سے۔ ایک عرب کے بدو کو تاتار کے چرواہے سے اور ایک ہندوستان کے نومسلم کو مکہ معظمہ کے صحیح النسب قریشی سے پیوست و یک جان کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے جو اسے توڑ سکے۔ اور اس زنجیر کو کاٹ سکے۔ جس میں خدا کے ہاتھوں نے انسانوں کے دلوں کو ہمیشہ کے لئے جکڑ دیا ہے۔ (الہلال ۲۷ نومبر ۱۹۱۳ء)

ہم قارئین سے پوچھتے ہیں کہ اگر ان سطور کا لکھنے والا سنہ ۱۹۵۷ء میں یہ کہے کہ میں دورِ الہلال ہی میں اشتراکِ وطن کی بنا پر قومیت کے نظریہ کا متبع اور مبلغ تھا تو اس کے متعلق آپ کا فیصلہ کیا ہوگا؟

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں سنیے۔ وہ اسی الہلال میں لکھتے ہیں:۔

مسلمان اور کانگریس

"ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی روح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اور قومیں بھی۔ لیکن مسلمانوں کی کوئی علیحدہ قومیت نہیں جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کے جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب یا بالفاظ مناسب تر ان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دیں گے اس وقت تک ان میں نہ قومیت کی روح پیدا ہو سکے گی اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں جو تاثیر دیکھتی ہے مسلمانوں کے لئے وہ اثر صرف "اسلام" یا خدا کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں "نیشن" کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلہ میں اگر کوئی لفظ ہے تو "خدا" یا "اسلام" ہے۔"

جن غیر مسلموں کے ساتھ مل کر وہ "ایک قوم" بنانے کے اصول کو عین اسلامی قرار دیتے تھے ان کے متعلق وہ وہ اپنے دورِ الہلال میں یہ عقیدہ رکھتے تھے۔

ہندوؤں کے متعلق

"کفار جو واقعات کو جھٹلاتے ہیں، حقیقتِ حال کو جھٹلاتے ہیں۔ اصلیت کو چھپاتے ہیں، ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں۔ نقضِ امن کرتے ہیں اور پھر اس کو حفظِ امن کا لباس پہناتے ہیں۔ قتل کرتے ہیں اور بے حیائی سے بخشش دکھاتے ہیں۔ بات کچھ ہوتی ہے مگر اپنی بات کی پیچ میں جمہور (پبلک) کو کچھ اور جتاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اطاعت منع ہے۔ ان کی فرمانبرداری جرم ہے۔ گناہ ہے موجب عذاب ہے۔ اس قلادے کو توڑ دینا چاہیئے۔ اس اطاعت سے تبری فرض ہے۔ اس فرمانبرداری پر نافرمانی کو ترجیح ہے۔ اُن کی تو خواہش ہے کہ مسلمان مداہنت کریں۔ خوشامد کریں۔ ریاکاری کریں۔ منافقت کریں تو انھیں بھی اظہارِ نفاق کا موقع ملے۔ مگر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ صورت کس حد تک خطرناک ہے؟ کفار کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزتِ نفس و شرف کا انھیں لحاظ تک نہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے۔ اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں مگر ہاتھ سے کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلت کی بات ہے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کر رہا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ ان کے حلف پر نہ جانا۔ یہ ادھر کی بات ادھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منع خیر

کے لئے نہایت مبالغے کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ تعدی ان کا شیوہ ہے۔ تمرد ان کی عادت ہے۔ سرکشی ان کی خو ہے ...... [1] پھر ایسے لوگوں کی اطاعت کیونکر پسندیدہ ہو سکتی ہے؟ ان کو تو اپنے مال و اولاد کی فراوانی و کثرت یعنی زر و دولت و کثیر آبادی کی وجہ سے اتنا گھمنڈ ہو گیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کو پرانے ڈھکوسلے کہنے لگے ہیں۔" (الہلال ستمبر ۱۹۱۳ء ۲۷)

دوسری جگہ رقم طراز ہیں:۔

"کفار سے مسلمانوں کو ساز باز نہ رکھنی چاہیئے۔ ان سے بے تعلق ہونا لازم ہے۔ جو ساز باز رکھتے ہیں جنہیں ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات و مصائب کا اندیشہ ہو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہو گی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرت کاملہ کوئی اور انتظام کرے گی اس وقت معلوم ہوگا کہ الآن قد ندمت ولا ینفع الندم۔ اس وقت تم نادم ہوئے، جب ندامت مفید ہی نہ رہی۔" (مضامین آزاد حصہ سوم)

یہ تھے الہلال کے دور کے مولانا آزاد کے خیالات ان ہندوؤں کے متعلق جن کی معیت میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری دن گزارے اور انہی کی آغوش میں جان دیدی۔ یہاں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی

ایسا کیوں ہوا

زندگی میں ایسا عظیم انقلاب کیسے آیا؟ وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے ہندوؤں کے ساتھ کیسے جا ملے؟ اس کا جواب بھی خود انہی کی زبان سے سنئے۔

"سالکِ راہِ حریت و صداقت کے پاؤں میں اس کے دشمن لوہے کی زنجیریں ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ آئندہ کے منازل طے نہ کر سکے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ زنجیر لوہے کی جگہ سونے کی ہوتی ہے۔ وہ اس طلسمی زنجیر کو دیکھ کر راہ و رسمِ منزلِ صداقت پرستی سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف دوڑ جاتا ہے اور مسکراتا ہوا خود دشمن کے ہاتھ سے لے کر اپنے پاؤں میں ڈال لیتا ہے۔ یہ طلسمی زنجیر کیا ہے؟ امید زر اور طمعِ جاہ۔"

اسلام سے مایوسی

لیکن ہمارے نزدیک اس کی وجہ اس سے بھی زیادہ گہری تھی۔ اور وہ یہ کہ مولانا آزاد اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے۔ انہیں اس کی ابدیت پر ایمان ہی نہیں رہا تھا۔ اس سے پہلے ہم اس نتیجہ پر قرائن کی رو سے پہنچے تھے۔ لیکن اپنی اس آخری کتاب میں انہوں نے اس حقیقت کا کھلے بندوں اعتراف کر لیا ہے۔ وہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے خطوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لوگوں سے یہ کہنا کہ زمین کے ایسے قطعوں میں جو جغرافیائی۔ لسانی اور ثقافتی لحاظ سے اس قدر مختلف ہوں

---

[1] یہاں مولانا صاحب نے کفار کو بدعمل اور حرامکار تک لکھ دیا ہے۔ ہم نے یہ حذف کر دیا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

> مذہبی جماعت اگر وحدت پیدا کر سکتی ہے بہت بڑا فریب ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام نے ایک ایسی برادری کی تشکیل چاہی تھی جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حدود و ثغور سے بلند ہو کر وجود میں آئے۔ لیکن تاریخ سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ ایک مختصر سے عرصے کے بعد۔ جسے زیادہ سے زیادہ سو سال کا عرصہ کہئیے اسلام اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ مختلف ممالک کو دین کی بنیادوں پر ایک وحدت بنا سکے (صفحہ ۲۳)

یہ ہے وہ حقیقی سبب جس کی بناء پر یہ صاحب، دین کی بنیادوں پر وحدت کے اصول کو چھوڑ کر، وطنیت کی بنیادوں پر قومیت سازی کے اصول کے پیرو بن گئے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ اسلام نے ایک بلند آہنگ دعویٰ کیا تھا لیکن تاریخ نے اس کی تکذیب کر دی اور یہ بتا دیا کہ وہ دعویٰ ناممکن العمل تھا۔ اب لوگوں کو اسلام کے اُس اصول کی طرف دعوت دینا "بہت بڑا فریب" ہے۔ لیکن یہ وہی فریب تھا جسے یہ "بزرگوار" خود برسوں تک مسلمانوں کو یہ کہہ کر دیتے رہے کہ

> یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا بجرد اس اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ مصری ہو، خواہ الجیریا کا وحشی ہو۔ خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندانِ توحید کا عضو ہے جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ (الہلال ۱۱/۱۹۱۲ء)

بلکہ ان سے بھی زیادہ بلند آہنگ اور پُرشکوہ الفاظ میں

> بس اے عزیزانِ ملت! اور اے بقیہ ہم زدگانِ قافلۂ اسلام!! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے کہ اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیروئے توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان ساٹھ کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامیٔ وطن کے حلق بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعتِ نزع میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو۔ اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج طرابلس کے میدانوں میں حاملینِ کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھن رہے ہیں تو ہم اللہ اس کے ملائکہ اور اس کے رسول کے آگے ملعون ہوں۔ اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے

تو مجھ کو کہنا چاہیئے کہ اگر میدانِ جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے کیونکہ ملت اسلامیہ ایک جسم واحد ہے۔ اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء و جوارح ہیں۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر رہیں۔ (ایضاً)

یہی وہ حضرت آزاد جو اپنی زندگی کے آخری دور میں اس کا اعلان کرتے ہیں کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے مسلمانوں سے یہ کہنا کہ تم ایک برادری کے افراد ہو بہت بڑا فریب ہے۔ یہ ہیں "اسلام کے بہت بڑے مجتہد" جو اپنی "تحقیقاتِ عالیہ" کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام نے وطن اور نسل کی حدود سے بلند ہو کر ایک بہت بڑی برادری قائم کرنے کا خیال کیا تھا لیکن تاریخ نے اسے جھٹلا دیا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ اسلامی اصول عملی دنیا میں چلنے کے قابل نہیں ہیں۔

یہ تھا اسلام کے متعلق ان کا ایمان! غور کیجئے۔ ایک غیر مسلم مؤرخ اپنی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

اسلام کوئی ناممکن الحصول نصب العین متعین نہیں کرتا

Hitti- History of the Arabs P. 129

اور جناب آزاد اسلام کے بنیادی اصول کو ناممکن العمل قرار دیتے ہیں۔ گبن (Gibbon) جیسا متعصب مؤرخ تو یہ کہتا ہے کہ

جو چیز ہمارے لئے سب سے زیادہ وجہ حیرت ہے، وہ اسلام کی اس قدر جلد اشاعت نہیں بلکہ یہ کہ اس کی تعلیم کس قدر ابدی حقائق پر مبنی ہے (زوال و ہبوط روما۔ صفحہ ۲۰۴)

اور یہ صاحب فرماتے ہیں اسلام نے ایک تجربہ کیا تھا جسے تاریخ نے جھٹلا دیا۔ "ملحد اور بے دین" مفکر، مورخ اور سیاست دان، اپنی تحقیقات، تجارب اور مشاہدات کے بعد نیشنلزم کے متعلق اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

نیشنلزم انسانی تاریخ میں سب سے بڑا مفسدہ ہے

The State of the World -Adam de Hegedüs

اور اس نتیجہ پر کہ

نیشنلزم نوعِ انسانی کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے

Bertrand Russell in "The Hope For A Changing World.

اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ

مسلمانوں کا اخوتِ باہمی کا عقیدہ یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدے سے کہیں بہتر ہے اور یہی عقیدہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے۔

Toynbee - The World and the West P. 30

وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ہمیں توقع ہے کہ

تم اپنے عالمگیر مؤدت واخوت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظر تصور اپنے ہاں رائج نہیں کروگے ایک عالمگیر برادری کا تصور ویسے تو نوعِ انسانی فلاح کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے۔ لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۰)

غیر مسلم مؤرخین ومفکرین تو یہ کہہ رہے ہیں اور ہمارے یہ "امام الہند" فرماتے ہیں کہ اسلام نے عالمگیر برادری کا ایک ناممکن العمل تصور پیش کیا تھا جسے تاریخ نے جھٹلا دیا!

اسلام کا طالب العلم اس حقیقت سے بے خبر نہیں (اور خود مولانا آزاد اپنے دور الہلال میں اس حقیقت کو متنوع انداز سے سامنے لاتے رہے ہیں) کہ قرآن کریم نے دنیا کے فکر وعمل کے لئے جو انقلابی تصورات دیئے ہیں ان میں یہ تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ انسانوں کی تقسیم وطن، زبان، نسل، رنگ وغیرہ کے امتیازات سے نہیں ہوتی۔ ان کی تقسیم کفر وایمان (آئیڈیالوجی) کی بنا پر ہوتی ہے۔ یہ قرآن کا اساسی اور غیر متبدل اصول ہے۔

قرآنی اصولوں کی پوزیشن

اس حقیقت سے بھی قرآن کا کوئی طالب العلم بے بہرہ نہیں کہ قرآن کے کسی اصول یا تصور سے متعلق یہ کہنا کہ اس پر کچھ وقت کے لئے تجربہ ہوا تھا لیکن وہ ناکام رہا اور اس طرح تاریخ نے بتا دیا کہ وہ اسلامی اصول ناممکن العمل تھا۔ لہٰذا اب اس ناکام تجربہ کو دہرانا حماقت ہے، انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ قرآن کے متعلق صحیح ایمان یہ ہے کہ اس کے تمام اصول وتصورات ابدی حقائق پر مبنی ہیں جو ہر دور میں ممکن العمل ہیں۔ اور اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے نوعِ انسانی کی راہ نمائی کریں۔

اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے اصولوں پر قرنِ اول میں تجربہ ہوا۔ ان کے مطابق معاشرہ قائم ہوا اور اس نے اپنے نتائج بھی پیدا کر دکھائے۔ لیکن کچھ وقت کے بعد معاشرہ نے ایک اور شکل اختیار کر لی اور ان قرآنی اصولوں کی جگہ دوسرے اصولوں نے لے لی۔ اس سے اکثر غیر مسلم مورخ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اسلام کے اصولوں میں یہ صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ زیادہ دیر تک زمانہ کا ساتھ دے سکتے۔ اس لئے ان کی جگہ دوسرے اصولوں نے لے لی۔ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ اگر بعد میں آنے والے لوگ ان اصولوں کو برقرار رکھتے اور وہ اصول اپنے نتائج مرتب کرنا چھوڑ دیتے تب یہ کہنا درست ہوتا کہ کچھ عرصہ کے بعد ان اصولوں میں نتائج پیدا کرنے کی

صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ بعد میں آنے والوں نے ان اصولوں ہی کو چھوڑ دیا اور ان کی جگہ غیر قرآنی اصول اختیار کر لئے۔ اس سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان (پہلے) اصولوں میں زندگی بخش صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ اگر ایک مریض کوئی دوائی استعمال کرتا ہے جو اسے فائدہ دیتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اس دوائی کا استعمال چھوڑ دیتا ہے اور اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیسے نکل سکتا ہے کہ وہ دوائی (جسے وہ استعمال کر رہا تھا) اس قابل نہیں تھی کہ اسے شفا دیدیتی۔

مولانا آزاد بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآنی اصولوں میں زیادہ دیر تک چلنے کی صلاحیت نہیں تھی اس لئے انہیں ترک کر دیا گیا۔ حالانکہ اگر وہ قرآن اور تاریخ کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرتے تو وہ اس حقیقت تک بآسانی پہنچ سکتے تھے کہ ان اصولوں میں تو ہمیشہ تک کے لئے آگے چلنے کی صلاحیت تھی لیکن خود مسلمانوں نے ان اصولوں کو ترک کر کے ان کی جگہ غیر قرآنی اصول اختیار کر لئے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا اور اتنی بڑی ٹھوکر کھائی جس نے انہیں کہیں کا نہ رہنے دیا۔ وہ قرآنی اصولوں کی ابدیت کے قائل نہیں رہے تھے اور اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے۔ ان کا تفسیری ترجمہ (ترجمان القرآن) ان کی اسی قلبی اور ذہنی کیفیت کا غماز تھا۔ اسے اب انھوں نے واضح تر الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

آخر میں ہم ایک نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ اگلے دنوں ہم نے مولانا آزاد کے کسی نظریہ کے خلاف کچھ لکھا تو ایک صاحب نے کہا کہ کسی کے مرنے کے بعد اس کے خلاف کچھ نہیں کہنا چاہیئے۔ یہ کلیہ درست نہیں۔ اگر کوئی شخص ایسے خیالات دنیا میں چھوڑ جاتا ہے جو اس کے مرنے کے بعد بھی لوگوں کو متاثر کر سکتے ہیں تو ان خیالات پر تنقید ضروری ہوتی ہے تاکہ لوگ غلط خیالات کی اتباع سے تباہی کے راستے پر نہ چل نکلیں۔ یہ تنقید مرنے والے کی ذات کے خلاف نہیں ہوتی۔ اس کے گمراہ کن خیالات کے خلاف ہوتی ہے۔ مولانا آزاد کی کتاب پر تنقید کے سلسلہ میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔ پاکستان میں اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ یہاں (بدقسمتی سے) ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو مولانا آزاد کو قرآن کا بہترین مفسر اور اسلام کا بہترین ترجمان خیال کرتے ہیں، اور اسی بنا پر ان کے سیاسی مسلک کو دین کے عین مطابق سمجھتے ہیں، اور پھر اپنے اس خیال کو عام بھی کرتے رہتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے ضروری سمجھا کہ مولانا آزاد کے مسلک کو خود انہی کے آئینہ میں پیش کر کے بتا دیا جائے کہ اسلام کے متعلق ان کے خیالات کیا تھے؟ تاکہ وہ لوگ جو قلب سلیم رکھتے ہیں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔

کتابوں کے متعلّق ضروری اطلّاعات

۱۔ الفتنۃ الکبریٰ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری کی شہرہ آفاق کتاب کا رواں اردو ترجمہ۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں جو عبرت آمیز واقعات نمایاں ہوئے ان کی عالمانہ تحقیق اور محققانہ تبصرہ۔ کتاب جون کے آخر تک تیار ہو جائے گی۔ آرڈر بھیج دیجئے۔

۲۔ فجر الاسلام علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی معرکۃ الآراء تصنیف کا اردو ترجمہ جو "اسلام کی سرگزشت" کے عنوان سے مسلسل طلوع اسلام میں شائع ہو رہا تھا۔ اب مکمل شکل میں ایک جلد میں چھپ رہا ہے۔ کتاب عنقریب پریس میں جا رہی ہے۔

۳۔ سلیم کے نام خطوط نیا ایڈیشن پریس میں چلا گیا ہے۔ اس میں پہلے ایڈیشن کے تمام خطوط پر نظرثانی کی گئی ہے اور جو خطوط اس کی اشاعت کے بعد لکھے گئے تھے وہ سب شامل کر لئے گئے ہیں۔ اس وجہ سے کتاب دو جلدوں میں شائع ہو رہی ہے۔ اردو لٹریچر میں اس کتاب کا جواب نہیں۔ اپنے لئے نسخہ بُک کرا لیجئے۔ اس کتاب کی بڑی مانگ ہے۔

۴۔ انسان نے کیا سوچا؟ وہ کتاب جو مصنف کے تبحر علمی اور وسعت مطالعہ کی زندہ شہادت ہے اردو تو ایک طرف اس انداز کی کتاب دنیا کی کسی زبان میں بھی شائع نہیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بعد نظرثانی طباعت کے لئے جا رہا ہے۔

"خود فیصلہ کیجئے" حدیث کے موضوع پر ایک عجیب و غریب پمفلٹ ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد انسان پر عجیب حقائق منکشف ہوتے ہیں اور وہ گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے کہ

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

اس کی قیمت دو آنے ہے۔ بہتر ہو کہ آپ آٹھ پمفلٹ منگا لیں۔ خود بھی پڑھیں اور دوسروں تک بھی پہنچا دیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

حقائق و عبر

۱۔ ہمارا ہمسایہ

مندرجہ ذیل اقتباس کو ذرا غور سے دیکھئے۔

"تقسیم ملک سے قبل کانگرس کے بڑے بڑے لیڈر صرف مسلم دشمنی اور پاکستان کے قیام میں رکاوٹ ڈالنے کی غرض سے سکھوں کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی خاطر ہر وقت سکھوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے رہے۔ سکھوں نے مستقبل کا خیال کئے بغیر اپنی سادگی اور اس چاپلوسی کی وجہ سے جو کانگرسی لیڈران کی کر رہے تھے ہندوؤں کا ساتھ دیا اور مظلوم مسلمانوں پر ہندو فرقہ پرست عناصر کے اشارے پر ظلم کئے جس سے آج بھی سکھ پنتھ شرمندہ ہے۔ اب جبکہ کانگرس کا کام نکل گیا یعنی مشرقی پنجاب مسلمانوں سے چھین لیا گیا، تو کانگرسی لیڈر اب سکھوں کو غیر وفادار کہتے ہیں اور انہیں آنکھیں دکھاتے ہیں۔"

یہ اقتباس کسی مسلمان اخبار یا مسلم لیڈر کے بیان سے نہیں لیا گیا۔ یہ دہلی کے روزنامہ "پربھات" کا اقتباس ہے جسے ہم نے کانپور کے اخبار "ہماری آواز" کی ۴ر مارچ کی اشاعت کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اے کاش! دنیا کی آنکھیں ہوتیں اور وہ ان حقائق سے اندازہ کر سکتی کہ پاکستان کو کس قسم کی قوم کی ہمسائیگی میں رہنا پڑ رہا ہے۔

فغانِ من دلِ خلق آب کرد و رنہ ہنوز
نگفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

۲۔ بھینٹ لینے والا خدا!

عبدالماجد صاحب دریا بادی کے اخبار صدق جدید (لکھنؤ) کی ۲۷ر مارچ سنہ ۱۹۵۹ء کی اشاعت کے صفحہ اول پر ایک موثر حکایت کے عنوان سے حسب ذیل کہانی شائع ہوئی ہے۔

فتحپور (یو پی) کے مولوی حاجی حکیم ظہور الاسلام کو گزرے ہوئے کچھ ایسا زمانہ نہیں گذرا ہے۔ ابھی مرحوم کے سینکڑوں دیکھنے والے موجود ہوں گے۔ ندوہ کے ایک اجلاس کے موقع پر ان سطور کے راقم کو بھی اپنے لڑکپن میں زیارت نصیب ہوئی تھی۔ بڑے صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے صاحب دل بھی تھے اور تقویٰ اور خوف خدا کے ایک پیکر مجسم۔ شہر میں ایک بار ہیضہ پھیلا اور لوگ چٹ پٹ ہونا شروع ہو گئے۔ مدرسے سے متعلق ایک دارالاقامہ بھی تھا۔ اس کا ایک غریب پردیسی لڑکا، دور دراز بنگالہ دیس کا رہنے والا، بھی مبتلا ہوا۔ اور مولانا کو اس کی خبر ہوئی بے قرار ہو گئے۔ اسپتال بھجوانے کے بجائے، خود جا مریض کو جھٹ اپنے گھر اٹھا لائے۔ ہیضہ کا مریض۔ اور وہ بھی کوئی اپنا عزیز نہیں۔ اسے اپنے گھر اٹھا لانا کوئی معمولی بات تھی؟ موت و ہلاکت کو اپنے ہاں دعوت دینا تھی! اور اب خدمت و تیمار داری مولانا نے خود شروع کی۔ ہیضہ کے مریض کی جو گندی حالتیں ہو سکتی ہیں، اُن سب کو تصور میں لے آئیے اور پھر سوچیے کہ مولانا اپنے ہاتھ سے دوا پلا رہے ہیں اور اس کی ایک ایک غلاظت کرتے جاتے ہیں۔ گھر والے ایسے موقع پر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اچھے اچھے عزیز دوست منہ چرا جاتے ہیں۔ یہ مولانا کیا بشر نہ تھے کوئی فرشتہ تھے؟

مریض کی حالت گرتی گئی۔ بگڑتی گئی۔ اور ادھر مولانا کی گریہ وزاری بھی بڑھتی گئی۔ بار بار دعائیں اپنے رب اور زندگی و موت دونوں کے خالق سے تھیں کہ "اے اللہ اس پر رحم کر غریب پردیسی ہے۔ اپنے باپ کا اکلوتا ہے"۔ ساری رات دوسرے تیمار دار کہاں تک ساتھ دیتے۔ ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے اب تنہا دنیا کا مالک دو لی تھا، اور اس کا یہ وفا شعار غلام اُس سے راز و نیاز میں مصروف۔ راوی کا بیان ہے کہ پچھلے پہر میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ مولانا جانماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں اور اپنے ناز بردار خالق کے آگے مچل رہے ہیں سرگوشی کے لہجے میں۔ رات کے سناٹے میں دعا کے الفاظ کچھ اس طرح کے سنائی دیئے۔

• مالک ہو جو چاہو سو کرو۔ قادر مطلق ہو۔ جو چاہو کر ڈالو۔ قانونِ قدرت تمہارا اپنا بنایا ہوا ہے۔ جب چاہو اسے توڑ سکتے ہو۔ آخر مجھے تو شرمندہ کرنا۔ یہ بچہ پردیسی ہے۔ میرے بھروسے پر آیا تھا۔ ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔...... میرا اگر یوں مجھ گنہگار کی دعا قبول نہیں کرتے تو میری نذر ہی قبول فرما لو۔ جان کے بدلے جان حاضر ہے۔ ایک میرا اپنا بچہ ہے لے اس کے عوض میں قبول فرماؤ۔ وہ بھی تمہارا۔ میں بھی تمہارا!

اور یہ بھی سن لیجئے۔ مولانا کے کئی بچے نہ تھے۔ کئی بچوں کے گذر جانے کے بعد یہی ایک سات سال کی عمر کا زندہ تھا۔ ماں باپ ہی نہیں۔ گھر بھر کے ارمانوں کا مرکز ــــ ایک محض اجنبی کی خاطر نذر اسی جگر کے ٹکڑے کی پیش ہو رہی تھی!

امتحان۔ ابراہیمؑ کا نہیں۔ ایک ابراہیمی کے ظرف و تحمل کا در پیش تھا! اللہ اللہ!

سحر ہو رہی تھی کہ اچانک مکان کے اندر سے کنڈی کھٹکی معلوم ہوا کہ بچہ پر وبا کا حملہ ہو گیا۔ مولانا اطمینان سے اٹھ کر اندر گئے۔ دوا پلائی۔ نفع خاک نہ ہوا۔ مولیٰ نے بندہ کی نذر قبول کر لی تھی۔ عبدیت کی کمان سے چھٹا ہوا تیر نشان پر پہنچ چکا تھا۔ اُدھر وہ پردیسی اچھا ہوتا گیا۔ اِدھر یہ نازوں کا پالا۔ اپنا بیٹا گرتا گیا۔ یہاں تک کہ مولانا اپنے ہاتھوں جا کر اپنے جگر گوشہ کو پیوند خاک کر آئے!

غور کیجئے کہ یہ حضرات خدا کے متعلق کس قسم کا تصور دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اُس خدا کا تصور جس کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۴) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن مولوی کی غرض تو اپنے وعظ کو دلچسپ بنانا ہوتی ہے۔ اسے اس سے کیا مطلب کہ اس زیب داستان سے خدا کا کیا تصور قائم ہوتا ہے اور دین کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

۳۔ کتب حدیث کی صحیح پوزیشن

صدق جدید ہی کی دس اپریل ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ مصر میں بعض کاشتکاروں کو انجیل کا ایک نیا نسخہ ملا ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کے ۱۱۴ مقولے درج ہیں۔ جن میں سے اکثر بالکل نئے ہیں۔ اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے جریدہ مذکور رقمطراز ہے۔

> نئی نئی انجیلوں کی دریافت کا سلسلہ تقریباً دو ہزار سال گذر جانے پر اب تک قائم ہے اور مسیحیت کی ابتدائی صدیوں میں جتنی انجیلیں مل چکیں ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ چار مشہور و متعارف انجیلیں ہیں۔ یہ تو اس سارے ذخیرے کو مسترد کر کے مستند قرار دی گئی ہیں۔ کوئی نسبت بھی استناد و محفوظیت کے معیار سے انجیلوں کے ذخیرے کو قرآن سے ہے۔ کیا قرآن بھی سو پچاس نہیں دس بیس کی تعداد میں کوئی اور دریافت ہوئے ہیں؟ کوئی ایک بھی دوسرا قرآن کہیں مل سکا ہے؟ انجیلیں جتنی بھی ہیں سب حضرت مسیحؑ کے ملفوظات و سوانح ہی کے دعوے دار ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ ہمارے ہاں کی صرف کتب حدیث و سیر کی ہم سطح ہو سکتی ہیں۔ کتنا بڑا ظلم ہے ایسی کتابوں کو قرآن مجید کے مقابلہ پر لانا۔

دریابادی صاحب نے فرمایا یہ ہے کہ

(۱) اناجیل کی حیثیت ہمارے یہاں کی کتب احادیث و سیر کی سی ہے۔

(۲) اناجیل کو قرآن مجید کے مقابلہ پر لانا بہت بڑا ظلم ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب اناجیل کو قرآن مجید کے مقابلہ پر لانا بہت بڑا ظلم ہے تو کیا کتب احادیث کو جو اناجیل کی ہم سطح ہیں، قرآن مجید کے مقابلہ پر لانا اور انھیں مثلہ معہ قرار دینا ظلم نہیں؟

---x---

مسئلہ تقدیر

قارئینِ طلوعِ اسلام سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی کا تعارف اس سے قبل ہو چکا ہے۔ یہ بزرگ یورپ میں بیٹھے جس قسم کا اسلام اہلِ مغرب کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اس کے کچھ نمونے بھی ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک اور نمونہ ملاحظہ کیجئے! اس دفعہ مسئلہ زیرِ بحث جبر و قدر کا ہے۔ ارشاد ہے۔

مشیت و تقدیر یا جبر و قدر کا معمہ ایسا ہے جو تنہا منطق کی رو سے کبھی حل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اگر انسان اپنے تمام اعمال میں صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ تو پھر خدا کے قادرِ مطلق ہونے سے کیا مفہوم ہے اور اگر خدا نے انسانی اعمال کو پہلے سے مقدر کر رکھا ہے تو انسان کی ذمہ داری کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا؟

مسئلہ کی شکل آپ کے سامنے آگئی۔ اس کے بعد اس کا حل ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں۔

نبی اکرمؐ نے اپنے متبعین کو سخت ہدایت فرمائی تھی کہ وہ اس مسئلہ پر گفتگو نہ کیا کریں۔

یعنی ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ مسئلہ ایسا ہے جسے نہ تو قرآن کریم حل کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے حضور نبی اکرمؐ اپنے متبعین کو سمجھا سکے تھے۔ اس کا حل حضورؐ نے (بقول ڈاکٹر صاحب) یہ بتایا تھا کہ اس موضوع پر گفتگو ہی نہ کی جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے۔ اس کی بنیاد ایک روایت پر ہے۔ لیکن انھیں اتنا سوچنا چاہیئے تھا کہ اس قسم کی ضعیف روایات کو اہلِ مغرب کے سامنے پیش کر کے، وہ ان کے دل میں نبی اکرمؐ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا کرتے ہیں؟ یہ کہتے وقت انھیں اتنا بھی خیال نہ آیا کہ اس قسم کے سوالات کے متعلق جو انسان کے دل میں بار بار پیدا ہوتے ہیں گفتگو کرنے سے روک دینا شکوک و شبہات کی پھانسوں کو اور گہرائی تک لے جاتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے جو اپنی بے مثال تعلیم سے، دلوں سے ہر قسم کے ریب و تشکیک کی پھانسوں کو نکالنے کے لئے تشریف لائے تھے، کبھی اس قسم کی تلقین نہیں فرمائی ہو گی۔

اس کے بعد خود ڈاکٹر صاحب کی طرف سے پیش کردہ حل ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اپنے خالق سے محبت کرتا ہے اور محبت میں منطق کی پیش نہیں چلا کرتی۔

چلئے۔ چھٹی پائی! مذہب میں عقل کا کیا دخل؟ ایمان سے فکر و تدبر کا کیا واسطہ؟

عقل کو دیارِ مذہب سے یوں دیس نکالا دینے کے بعد، ڈاکٹر صاحب عقیدۂ تقدیر کی تائید میں خود عقلی دلائل پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اسلام الہیاتی امور کو جنہیں صفاتِ خداوندی کہا جاتا ہے، دنیاوی امور سے[1] الگ رکھتا ہے اور مومنین کو عمل کی تلقین کرتا ہے۔ چونکہ مشیتِ خداوندی انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے، اس لئے وہ انسان سے کہتا ہے کہ اسے کسی کام میں ابتدائی ناکامی کے بعد مایوس نہیں ہو جانا چاہیئے۔ کامیابی کے لئے بار بار کوشش کئے جانا چاہیئے۔ تاآنکہ یا تو وہ مقصد حاصل ہو جائے اور یا اس کا حصول ناممکن بن جائے۔

اس طرح عقیدۂ تقدیر انسان کے لئے تسلی کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو اطمینان دے لیتا ہے کہ خدا کی مرضی ایسے ہی تھی۔ زندگی کا مقصد ابدی نجات ہے۔ اور دنیاوی امور میں ناکامی یا ناکامیابی اس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ جہاں تک نجات کا تعلق ہے، خدا اس معیار کے مطابق فیصلہ کرتا ہے کہ انسان کی نیت کیا تھی۔ اس نے کس حد تک کوشش کی اور اسے کس قدر کامیابی حاصل ہوئی۔ (بحوالہ الاسلام۔ انگریزی۔ مورخہ ۱۵ ۳/۵۹)

کیا ہم محترم ڈاکٹر صاحب سے اتنا دریافت کر سکتے ہیں کہ

(۱) جب نبی اکرمؐ نے مسئلہ تقدیر کے متعلق گفتگو کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ تو آپ نے خلافِ حکمِ رسالتمآب اس مسئلہ پر اس قدر طول طویل گفتگو کیوں فرمائی؟

(۲) جب محبت میں منطق کو دخل نہیں ہوتا تو آپ نے اس باب میں منطقی دلائل کیوں پیش کئے؟

حقیقت یہ ہے کہ پرانے مذہب کے مُلّا کے مقابلہ میں انگریزی خواں مُلّا اور بھی زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔ اول الذکر کا دائرۂ جہالت پاس کی مسجدوں اور حجروں تک محدود رہتا ہے۔ لیکن ثانی الذکر کی ذہنیت کے ظلمت افزا سائے یورپ اور امریکہ تک پھیل جاتے اور یوں اسلام کو غیروں کی نگاہوں میں اضحوکہ بنا دیتے ہیں۔

باقی رہا مسئلہ تقدیر سو اسے قرآن کریم نے اس طرح واضح کر دیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان کی روح وجد میں آجاتی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اسے سمجھ نہیں سکے تو اس میں قرآن کا کیا قصور؟

تیری نگاہ فرومایہ، ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ

---

[1] ملاحظہ فرمائیے کتاب "من و یزداں" میں مشیت سے متعلق باب

اقبال کے رازداں

۲۱ اپریل علامہ اقبالؒ کی وفات کا دن ہے اور اس لحاظ سے اس دانائے راز کی یاد تازہ کرنے کی سالانہ تقریب بھی۔ یوم اقبال کی یہ تقریب نہ صرف پاکستان میں منائی جاتی ہے بلکہ بیرونِ پاکستان میں بھی۔ کون اقبال؟ ہماری ملت کا وہ عظیم و جلیل حدی خواں جس کے آتشیں نغمے ہمارے مایوس، مضمحل اور درماندہ کاروانِ ملت کے لئے بانگِ رحیل ثابت ہوئے جس کے پیامِ حیات نے ایک کڑے اور نازک وقت پر اس قوم کی مسیحائی کی جس کی نبضیں ڈوب رہی تھیں۔ جس نے اس طوفانِ قیامت میں ہمیں پاکستان کا نشانِ منزل عطا کیا جبکہ ہمارے سامنے نہ کوئی منزل تھی اور نہ ذوقِ سفر۔ اُس خضرِ راہ نے اُس وقت ہماری تاریک راہوں میں قرآنی فکر کے چراغ روشن کئے۔ جب ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔

اقبال کے اس عظمت آفریں مقام کو نگاہوں کے سامنے رکھئے اور پھر اُس روئیداد کا جائزہ لیجئے جو سالہاسال سے یومِ اقبال کی آئینہ دار چلی آ رہی ہے۔ کراچی اور لاہور جیسے بڑے بڑے علمی و ادبی مرکزوں میں جنھیں اقبال کے نام پر لاکھوں روپے کی "فتوحات" ملتی ہیں یادگار مجلسیں آراستہ ہوتی ہیں۔ ملک کی بلند پایہ شخصیتیں ان اجتماعات میں رونق افروز ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے طویل و طویل، عالمانہ اور فاضلانہ مقالے شاعرِ مشرق کی یاد میں پڑھے جاتے ہیں۔ غرضیکہ مختلف اسالیب و متنوع انداز سے روحِ اقبال کو نذرِ عقیدت اور خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد انتہائی خوش فہمی بلکہ خود فریبی سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہم ایک عظیم فرض سے حسن و خوبی کے ساتھ سبکدوش ہو گئے۔

اور دماغی عیاشیوں کا یہ کھیل اس حالت میں رچایا جا رہا ہے۔ جبکہ اقبال کا عطا کردہ نشانِ منزل پھر نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ جبکہ ہم شعوری طور پر پاکستان کی آئیڈیالوجی کا احاطہ کرنے میں نااہل اور بے نصیب واقع ہوئے ہیں۔ جبکہ بارہ برس کی مسلسل صحرانوردیوں اور دماغ سوزیوں کے باوجود ہم ابھی تک مملکت کی نظریاتی اساس اور دستورِ مملکت کے بنیادی نکات طے کرنے کے قابل نہیں ہو سکے۔

ہاں ملت کی حرماں نصیبیوں میں یہ ایک سانحۂ قیامت ہے کہ یومِ اقبال کی مجلسوں میں وہ سب کچھ کہا جاتا ہے جو نہ تقاضائے وقت ہے اور نہ ملت کے مرضِ کہن کا چارہ۔ اور وہ سب کچھ کہنے سے گریز کیا جاتا ہے یا اس کا علم ہی نہیں جس کی ملک و ملت کو اشد ضرورت ہے اور جس کے بغیر ہم ذلت اور نامرادی کے جہنم میں مبتلائے فریب کھڑے ہیں۔

لاریب کہ اقبال کا پیغام کل کی طرح آج بھی ہمارے لئے مشعلِ ہدایت اور نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ (یہ سب کچھ سچا اور درست۔ اور ہم اس حقیقت پر یقینِ کامل رکھتے ہیں)۔ لیکن کیا اقبالیات کا کوئی اجارہ دار، فلسفہ اقبال کا کوئی شیدائی اور تصورِ پاکستان کا کوئی دیوانہ ہمیں یہ بتا سکے گا کہ یومِ اقبال کی ان مجلسوں میں کبھی پاکستان کی اُس آئیڈیالوجی پر روشنی ڈالی گئی ہے جسے اقبال اس مملکت کی روح دیکھنا چاہتا تھا؟ کبھی اس تصورِ مملکت کو اعلم تشریح

کیا گیا جو پیامِ اقبال کی وسعتوں میں گوہرِ آب دار بن کر چمک رہا ہے؟ کیا کبھی کسی مفسّرِ اقبال نے یہ بتلانے کی زحمت گوارا کی کہ اقبال کے نزدیک ہمارے الجھے ہوئے گوناگوں مسائل کا حل کیا ہے؟

یومِ اقبال کے سنجیدہ اور خالص علمی اجتماعات کو "موچی دروازے" کا اکھاڑہ بنانے کا امتیاز ضرور پیدا کیا گیا۔ فلسفہ اقبال کی علمی و فکری تبیین کے مقابلہ میں جذباتی اور دھواں دھار تقریروں پر نعرہ ہائے تحسین ضرور بلند ہوئے لیکن تقدیرِ امم کے اُن رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی نہ ہو سکی جو اقبال کے نغموں کی روح اور صدق لبسیط ہیں ۔۔۔ ہاں! اقبال کے نام پر وہی کچھ ہوا اور وہی کچھ ہو رہا ہے جو جذبات کے دھارے پر بہنے والی قوموں کا شعار ہے اور سنجیدہ فکر سے بے نصیب امتوں کی ذہنی عیاشیوں کا طرۂ امتیاز!

لیکن وقت کی کرشمہ سازی اور معجز نمائی ملاحظہ ہو کہ یومِ اقبال کے نام پر پیدا کردہ ان پریشان خیالیوں اور ظلمت آرائیوں میں اس بار بالآخر ایک کرن پھوٹی اور فضا میں روشنی سی پیدا کر گئی۔ علم و حکمت کے ایک شہرۂ آفاق مرکز میں ابھی ابھی یومِ اقبال کے سلسلے میں ایک مجلس کا انعقاد ہوا اور کہنے والا وہ کچھ کہہ گیا جو اقبال کی روح کی پکار اور ملت پاکستان کے لئے سرمایۂ حیات سے کم نہیں۔ تقریر کرتے ہوئے مقرر نے کہا۔

"کون نہیں جانتا کہ علامہ اقبال ہی نے سب سے پہلے مستقبل کی اسلامی مملکت کا خواب دیکھا اور سنہ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد میں پہلی بار اس کا خاکہ بھی پیش کیا۔ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک وطن قائم کرنے کا مطالبہ اگرچہ پوری وضاحت سے پیش نہیں کیا گیا تھا تاہم علامہ اقبال نے اسی معرکۃ الآرا تقریر میں اس کی بالکل صحیح ہیئت ترکیبی پیش کر دی تھی۔ اس تصور کو مسلمانوں کے قلب و روح میں راسخ کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا مگر ایک نصب العین بہرصورت وجود میں آ گیا تھا۔

اقبال کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے پاکستان کی مجوزہ اسلامی مملکت کا تصور پیش کرنے اور اس کی سرحدیں متعین کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ وہ اس سے بھی آگے گئے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ایسی مملکت کو کن نمایاں خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر فرد اور معاشرے کا وہ باہمی عمل اور ردّ عمل ناممکن ہے جو اقبال کی رائے میں دونوں کے عروج اور ارتقاء کے لئے ضروری ہے۔ میں آپ کو وہ اصول یاد دلانا چاہتا ہوں جو اس مقصد کی تکمیل کے لئے اقبال نے پیش کئے"۔ (نوائے وقت۔ ۱۰ اپریل)

اور پھر مقرر نے ان اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"پہلا اصول یہ تھا کہ اس مملکت کی بنیاد توحید پر ہونی چاہیئے کیونکہ اقبال بنی نوع انسان کی اخوت کے لئے توحید کو ایک لازمی عنصر سمجھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن کے قلوب اپنے نصب العین کے حصول کے جذبے سے سرشار ہوں اور جنہیں اپنے فرض کا شدید احساس ہو۔ تیسرے یہ کہ

اس کا ایک ضابطۂ اخلاق ہونا چاہیئے جو معاشرے کے عزائم اور نصب العین کا آئینہ دار ہو۔ اور اس کے علاوہ اس کا ایک قبلہ ہونا چاہیئے جس پر مملکت کی تمام سرگرمیاں اور وفاداریاں مرکوز ہوں۔ پھر اس مملکت کے لئے ایک نصب العین اور منزلِ مقصود بھی ضروری ہے جس کے حصول کے لئے پوری مملکت اور اس کے تمام شہری کوشاں ہوں۔ مزید برآں اسے قدرت کی طاقتوں پر حکمراں ہونا چاہیئے۔ اقبال کے تصور کے مطابق اس کا مطلب یہ تھا کہ مغربی دنیا کے مشینی اور سائنسی کارناموں سے استفادہ ضرور کیا جائے۔ مگر مغرب کی محکومی ہرگز قبول نہ کی جائے۔ ساتواں یہ کہ اس مملکت میں ایسی ہیئتِ اجتماعیہ کو فروغ دینا چاہیئے جو اس کے آزاد شہریوں کی شخصیت کی تکمیل و توسیع میں معاون ہو۔ ان کا آخری اصول یہ تھا کہ اس مملکت میں عورتوں کی ترقی اور نشو و نما کے تمام مواقع بہم پہنچائے جائیں:

خاتمۂ کلام پر مقرر نے کہا۔

"میری رائے میں اس عظیم الشان انسان نے پاکستان کے لئے جس طرز کا مدنی اور سیاسی نظام پیش کیا اس میں کسی رد و بدل کی گنجائش نہیں۔ آج ہم ان کا یومِ ولادت منانے کے لئے جمع ہیں اور اگر ہم بنظرِ غائر دنیا کا جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے ہر ملک کو اس سیاسی فلسفے کی ضرورت ہے جسے اقبال نے پیش کیا۔"

(نوائے وقت۔ ۱۰ رمئی)

فلسفۂ اقبال کی نقاب کشائی کا یہ حسن انداز ہمارے قارئین کے لئے یقیناً وجہ شادابیٔ قلب و نظر ہوگا اور وہ یقیناً یہ معلوم کرنے کے لئے بے تاب ہوں گے کہ اقبال کا رازداں یہ کون صاحبِ فکر پاکستانی مسلمان ہے جو یوں یومِ اقبال کا حق ادا کر گیا اور باقی سب کو پیچھے چھوڑ گیا۔ لیکن آہ! یہ سنکر یقیناً ان کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی کہ متاعِ اقبال کو اس فیاضی سے ہمارے قافلے میں لٹانے والا یہ مقرر نہ تو کوئی پاکستانی ہے نہ مسلمان اور نہ اقبال کا کوئی خصوصی متوسل۔ یہ علم افروز تقریر پاکستان یا عالمِ اسلام کے کسی مرکز میں نہیں ہوئی بلکہ یہاں سے ہزاروں میل دور لندن کی ایک مجلس میں ہوئی۔ اور مقرر تھے لندن یونیورسٹی میں اورنٹیل سٹڈیز کے پروفیسر جناب شیر وک ولیز۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اقبال کے نقطۂ نظر سے اسلامی مملکت کے جو آٹھ اصول بیان کئے وہ اقبال کی کسی تحریر سے مقتبس نہیں بلکہ اقبال کی پوری تعلیمات پر ذاتی غور و فکر کے بعد اخذ کئے گئے۔ کتنا اہم فرق ہے مغرب کی صاحبِ فکر اقوام اور ہم ایسی جذباتی قوموں میں۔ ہم گذشتہ بیس برس سے مسلسل اقبال کی یاد تازہ کرنے اور اسے سرمایۂ افتخار بنانے کے باوجود اس کے پیغام کو سنجیدہ غور و فکر کا موضوع نہ بنا سکے۔ اس کے فکر کی روشنی میں اپنی مملکت کی آئیڈیالوجی اس کے نصب العین، منزلِ مقصود اور اساسی تصورات کو متعین نہ کر سکے۔ اور بارہ برس کے بعد بھی ابھی پہلا قدم اٹھانے پر غور ہو رہا ہے۔ اور دوسری طرف وہ غیر مسلم اور غیر پاکستانی انگریز، جو اپنی زندگی میں چند بار اقبال سے ملا اور ایک

ہی مجلس میں فلسفۂ اقبال کے بارے میں وہ کچھ کہہ گیا جو ہماری مملکت کے نصب العین اور مقاصد کی صاف اور واشگاف انداز میں نشاندہی کر رہا ہے۔

یہ ہے فرق جذبات کے دھارے پر بہنے والی اور زندگی کے مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے والی قوموں کے افراد میں!

رسم الخط کا مسئلہ

اردو زبان کے لئے رسم الخط کا مسئلہ محض ایک لسانی مسئلہ نہیں بلکہ اس کا ہماری مملکت کے ثقافتی نشو و ارتقاء سے وہ گہرا رشتہ ہے جسے کسی قیمت پر نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ تعلیمی کمیشن کے سوالنامے کا جو جواب اپریل کے طلوع اسلام میں شائع ہوا اس میں رسم الخط کے متعلق کمیشن کو مجمل طور پر بتا دیا گیا تھا کہ

> عربی رسم الخط کے علاوہ اور رسم الخط ہمیں قرآن اور اس تصورِ حیات سے دُور لے جائے گا جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا۔

اس مختصر سے جواب میں کمیشن کو اس خطرے کی نشان دہی کر دی گئی تھی جو عربی رسم الخط کی بجائے رومن رسم الخط اختیار کرنے سے لاحق ہوگا۔ ہمیں مسرت ہے کہ ملک کے ہر حصے سے عربی رسم الخط کی پرزور تائید کی گئی اور اس سلسلہ میں انتہائی خوش کن شگون یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں ماہرینِ تعلیم، اصحابِ فکر و نظر اور نمائندگانِ علم و ادب کے ایک ممتاز اجتماع میں بھی رومن رسم الخط کی مخالفت کی گئی۔

ابھی ابھی سپریم کورٹ کے سابق جج اور مغربی پاکستان کی ایک نامور اور فاضل شخصیت شیخ محمد شریف صاحب نے لاہور کے ایک نمائندہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے رومن رسم الخط کی تجویز کو تباہ کن قرار دیا اور کہا کہ عربی رسم الخط کی بجائے رومن رسم الخط اختیار کر کے ہم ماضی کی تہذیب سے ہمیشہ کے لئے اپنا رشتہ منقطع کر بیٹھیں گے۔ محترم شیخ صاحب کے انتباہ کے الفاظ خاص طور پر غور و فکر کے محتاج ہیں۔

> اس بارے میں کوئی بھی پیشگوئی نہیں کر سکتا کہ ہم انسانی علوم کے ذخائر میں کیا اضافہ کریں گے۔ لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ رومن رسم الخط اختیار کر کے ہم بیک جنبشِ قلم اس انمول خزانے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے جو ہماری بے شمار نسلوں کی صدیوں کی محنتِ شاقہ کا حاصل ہے۔

محترم شیخ صاحب کے یہ الفاظ کروڑوں پاکستانیوں کے احساسات کے ترجمان ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اس معاملہ میں زمامِ کار جن ہاتھوں میں ہے وہ ملت کی آواز کا کما حقہٗ احترام کریں گے۔ اگر غلط فہمی سے کسی رجحان نے رومن رسم الخط کی حمایت کا رخ اختیار کر لیا تو یہ ملت کی امنگوں اور اس کی تہذیب کا رخ ایسی سمت موڑ دے گا جس کے افسوسناک

نتائج و عواقب کا پورا پورا اندازہ شاید ابھی نہ لگایا جاسکے۔

عائلی کمیشن کی رپورٹ کے بعد

ازدواجی مسائل کی الجھنیں ہمارے معاشرے میں اس قدر شدت اختیار کرچکی ہیں کہ اس سے متاثر ہو کر سابقہ حکومت ایک عائلی کمیشن کے تقرر پر مجبور ہو گئی تھی۔ مذکورہ کمیشن نے ایک مدت تک ان الجھنوں کا جائزہ لیا اور پھر ایک سوالنامہ جاری کر کے رائے عامہ کا تعارف حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ بالآخر کمیشن کی وہ رپورٹ بھی منظرِ اشاعت پر آگئی جس میں کمیشن کے ایک رکن (مولوی احتشام الحق) کے سوا دیگر تمام ارکان نے اتفاق رائے سے اپنی سفارشات حکومت کو پیش کردیں۔

اس مرحلہ پر ہمارا مقصد نہ تو کمیشن کی رپورٹ اور سفارشات کے حسن و قبح پر اظہار خیال کرنا ہے اور نہ احتشام الحق صاحب کے اختلافی نوٹ پر کوئی تنقید مقصود ہے (طلوع اسلام میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے) بلکہ ہمارے سامنے اصل مسئلہ کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ کمیشن کی مذکورہ رپورٹ کے بعد اسلامک لاء کمیشن کا قیام عمل میں آگیا اور جہاں مروجہ ملکی قوانین کو اسلامی قالب میں ڈھالنا اس کمیشن کی ذمہ داری قرار پائی۔ وہاں عائلی کمیشن کی رپورٹ کو بھی حتمی طور پر شکل دینے کے لئے لاء کمیشن کے سپرد کردیا گیا۔

اسلامک لاء کمیشن کا ابھی ایک ہی اجلاس ہوا تھا کہ ملک میں عسکری انقلاب معرض وجود میں آگیا اور اس کے بعد جہاں ملکی آئین کو منسوخ کرنا پڑا وہاں لاء کمیشن کو بھی ختم ہونا پڑا۔ اس طرح عائلی کمیشن کی رپورٹ دھری کی دھری رہ گئی۔

آج جبکہ ہمارے ازدواجی مسائل کا الجھاؤ مزید تشویشناک صورت اختیار کر رہا ہے اور دوسری طرف انجمن خواتین پاکستان کی حقوق نسواں کمیٹی عائلی کمیشن کی رپورٹ کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ ہم حکومت سے بادب گزارش کریں گے کہ اپنی گوناگوں اور شدید مصروفیات کے باوجود وہ اس مسئلہ کی اہمیت پر ہمدردانہ غور کرے اور ایسا نہ ہو کہ کمیشن کی رپورٹ اور سفارشات کسی سرد خانہ میں منجمد ہو کر رہ جائیں۔ موجودہ صورت حال میں جبکہ اسلامک لاء کمیشن موجود نہیں یہ مناسب ہوگا کہ ایک کمیٹی مقرر کردی جائے جو قرآن و سنت (اور سنت قرآن کے خلاف جا نہیں سکتی) کی روشنی میں رپورٹ کا جائزہ لے اور اس کے بعد اسے بروئے کار لانے کا اقدام کیا جائے تاکہ ہمارے معاشرے کو ان تلخیوں، پریشانیوں اور الجھنوں سے نجات حاصل ہو جو لاتعداد گھرانوں میں جہنم کی کیفیت پیدا کئے جا رہی ہیں۔

حکومت مستحق تبریک ہے کہ اس نے "زر اور زمین" کے اہم مسائل کو حل کرنے کے لئے اپنے قدم آگے بڑھا دیئے ہیں۔ زر اور زمین کے ساتھ معاشرے کا تیسرا اہم مسئلہ "زن" کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اول الذکر دونوں مسائل کے ساتھ ساتھ حکومت "زن" یعنی عائلی زندگی کے مسائل کی طرف بھی توجہ دے گی۔ اگر ان مسائل کو قرآن کی روشنی میں سلجھا دیا جائے تو معاشرے کی معتدبہ تلخیاں خوشگواریوں میں بدل جائیں گی۔

آپ کے روپیہ کی قیمت بڑھ گئی

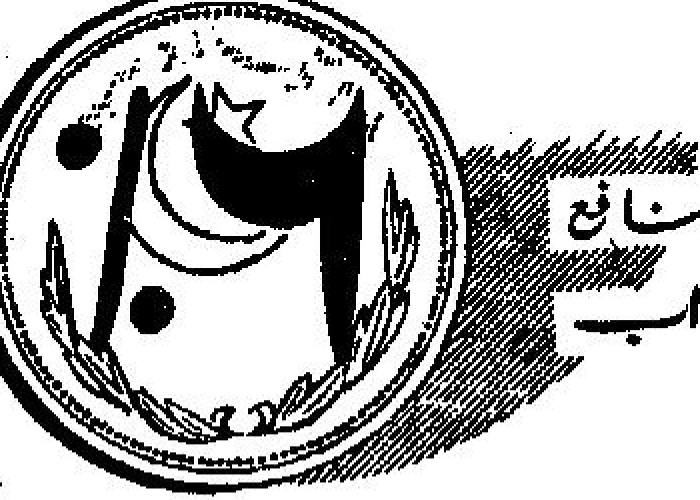

شرح منافع اب

قومی ترقی کے سیونگ سرٹیفکیٹ

کی شرح منافع میں مزید اضافہ

جو یکم اپریل ۱۹۵۸ء سے شمار ہوگا

قومی بچت کے سرٹیفکیٹوں کی شرح منافع میں مزید اضافہ۔ یعنی ۵ فیصدی کے بجائے ۶ فیصدی۔ قومی بچت کی تحریک میں ایک نئے باب کا آغاز ہے۔ آپ کے لئے روپیہ بچانا اب پہلے سے کہیں بڑھ چڑھ کر فائدہ مند ہو گیا ہے۔ خاص طور پر تھوڑا سا سرمایہ لگانے والوں کے لئے یہ روپیہ کمانے کی مفید ترین صورت ہے۔

ڈاکخانوں سے خریدیئے

روپیہ بچایئے اور فائدہ اٹھایئے

اسلام کی صحیح تعلیم سمجھنے کیلئے

ان کتابوں کا مطالعہ کیجئے

معراجِ انسانیت

(یعنی سیرت نبی اکرمؐ قرآنی آئینہ میں)

صفحات ۸۳۲ ۔ بڑی تقطیع مجلد گرد پوش دبکس ۔ قیمت ۲۰ بیس روپے

ابلیس و آدم

انسان آدم ملائکہ، ابلیس، شیطان، جنات، وحی، نبوت، رسالت جیسے اہم عنوانات پر بصیرت افروز تصنیف۔ دورِ حاضر کی عظیم کتاب قیمت ۸ آٹھ روپے

من و یزداں

خدا اور بندے کا باہمی تعلق کیا ہے؟ تقدیر کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ دعا کسے کہتے ہیں؟ اور یہ کس طرح اثر کرتی ہے۔ عظیم کتاب قیمت مجلد دس روپے

برقِ طور

بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی عبرت آموز داستان۔ قیمت ۶ چھ روپے

اس پتہ سے منگوائیے۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ کالونی لاہور